بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جگنوؤں کے دیس میں

ڈاکٹر محمد اقبال ہما

ضابطہ:

کتاب کا نام	جگنوؤں کے دیس میں
مصنف	ڈاکٹر محمد اقبال ہما
سن اشاعت	۲۰۲۶ء
کمپوزنگ	ڈاکٹر محمد اقبال ہما
پبلشر	ٹورسٹ پبلیکیشنز وہاڑی
زیر اہتمام	مون نوٹس۔ کبیر سٹریٹ اردو بازار، لاہور
قیمت	۹۰۰ روپے

انتساب

رُحما رانا

اور

مفلحہ راؤ

کے نام

اللہ عمر دراز اور نصیب اچھے کرے

جگنوؤں کے دیس میں

احسانِ دانش

ڈاکٹر محمد اقبال ہما کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد ہم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ صاحب سرجن اچھے ہیں یا کوہ نورد؟ سیاح اچھے ہیں یا سفر نامہ نگار؟ ہم نے انھیں آپریشن یا کوہ نوردی کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ان کے سفرنامے پڑھے ہیں۔ اس لیے ہم سفر نامہ نگار کے حق میں ووٹ دیتے ہیں۔ ان کے سفرنامے پڑھ کر تاثر ملتا ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال ہما ایک جنوں کا نام ہے اور اس مجنوں کی لیلیٰ پاکستان کے، خاص طور پر گلگت بلتستان کے پہاڑ، وادیاں، جھیلیں، آبشار، سبزہ زار اور ثقافت ہے۔ یہ سب انھیں اپنی اپنی زبان میں کوہ ندا کی طرح پکارتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب نہ صرف خود دوڑے چلے آتے ہیں، بلکہ اپنے دوستوں کو بھی آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موسمِ بہار میں شمالی علاقہ جات کے فطری حسن کی شراب اپنی پیاسی نظروں سے کشید کرتے ہیں اور گھونٹ گھونٹ کر کے موسمِ خزاں کی آمد تک پیتے رہتے ہیں۔ خزاں کی دستک سنتے ہی وہ رنگوں کی بہار چرانے کے لیے ایک مرتبہ پھر شمالی علاقہ جات کا رُخ کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال ہما وہ خوش قسمت سیّاح اور سفر نامہ نگار ہیں جن کی شہرت ان سے پہلے گلگت بلتستان میں پہنچی تھی اور یہاں کے اہلِ علم وادب ان کی تحریروں کے سحر میں مبتلا ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے۔ٹو ٹریک کے لیے سکردو تشریف لائے تو ادب کے رشتے کا احترام کرتے ہوئے ہمارے ساتھ بلتستان کے سرکردہ اربابِ علم و دانش جناب یوسف حسین آبادی، جناب محمد حسن حسرت، جناب محمد عباس کھرگرونگ، جناب پروفیسر حشمت علی کمال الہامی مرحوم، جناب انور بلتستانی اور جناب بشارت حسین ساقی نے استقبالیہ محفلِ ادب منعقد کر کے انھیں بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ اب آیئے ڈاکٹر صاحب کے سفرنامے کی طرف

''جگنوؤں کے دیس میں'' صرف راستوں کا بیان نہیں ہے۔ یہ کتاب نانگا پربت کے دامن اور وادیِ روپل کی آغوش میں انسانی جذبوں اور حسنِ فطرت کی آمیزش کا آئینہ ہے۔ یہ سفرنامہ اُن لوگوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو سفر کی رنگینی کے ساتھ ادب کی رنگینی سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں؛ اور اُن کے لیے بھی جو زندگی کو فطرت کی آنکھ سے دیکھنے اور پرکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال ہما کے سفرناموں کا اندازِ نگارش دل موہ لینے والا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے الفاظ نہ صرف باتیں کرتے نظر آتے ہیں بلکہ کہیں کہیں اونچے سُروں میں گنگناتے اور نغمے سناتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریر کے اعجاز سے نانگا پربت اور وادیِ روپل کے جھرنوں کا ترنم ناقابلِ فراموش دھن میں ڈھل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مکالمہ نگاری مقتضائے حال کی بہترین مثال ہے۔ جیپ ڈرائیور ہو یا پورٹر، ہوٹل کا منیجر ہو یا کاونٹر کلرک، ڈاکٹر صاحب سب کے ساتھ اُنھیں کے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں اور اجنبیت کا احساس یکسر مٹا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال ہما کی تحریر میں فی البدیہہ اشعار گویا نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ضرب المثل اور محاورے کا استعمال تحریر کی گہرائی اور گیرائی میں ادبی چاشنی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی تحریر میں سفر کے حالات کے ساتھ ساتھ سیّاحت کردہ علاقے کی تاریخ، روایات اور ثقافت بھی قاری کے ہم قدم رہتی ہیں اور شعر وادب کا تڑکا انھیں بہت زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی متاثر کن انداز میں نئی نئی تراکیب اختراع کرتے ہیں اور بعض اوقات ایک لفظ میں معانی کا پورا سمندر بند کر دیتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات پر لکھے گئے اکثر سفرناموں میں مقامی زبان کے نام نہ صرف خلط ملط کیے جاتے ہیں، بلکہ توڑ مروڑ کر انھیں بے معنی بنا دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال ہما اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ وادیِ استور کی مشہورِ زمانہ راما جھیل کے بارے میں راما......رانا......رانگا......اور رانڑا کی تحقیق با کمال ہے۔ دھوپ چندن، لات۔ بو، گوٹم سر اور یونیا ٹیس کین کی وضاحت مقامی لہجے اور ثقافت کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال ہما جہاں گلگت بلتستان کے پہاڑوں، جھیلوں چشموں اور وادیوں کے عاشق ہیں، وہیں اس علاقے کے سفیر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تصویروں کے ذریعے اس علاقے کی خوب صورتی کو دنیا بھر کے قارئین و ناظرین تک پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر یقیناً اپنے متاثرین کو شمالی علاقہ جات کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیتی ہوگی۔

ہماری دلی دعا ہے کہ گلگت بلتستان کے چاروں موسم ہمیشہ اپنے اپنے اوقات میں بھرپور جوبن پہ رہیں، اللہ کے حکم ''سیروفی الارض'' کی تعمیل ہوتی رہے، ڈاکٹر محمد اقبال ہما جیسے سیاح ہر موسم کا رنگ چرانے کے لیے آتے رہیں اور ہمیں رنگین سفرنامے پڑھنے کو ملتے رہیں۔

احسان علی دانش (سکردو)

بات ہیرا ہے بات موتی ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

خوش گفتار، خوش بیان، خوش نظر، خوش آواز، خوش خلق، خوش مزاج اور خوش خط بھی
یہ اوصاف ڈاکٹر محمد اقبال ہما کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ان سے میرا تعارف آٹھ نو سال قبل ہوا جب وہ ادبی مجلّے ''پیامِ ادب'' کی تقریب رونمائی میں بطور مہمان خصوصی تشریف لائے۔ انھوں نے مجلّے کے ادبی محاسن پر گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ ان کی گفتگو میں ادبی چاشنی تو ہے ہی، وہ تجزیے اور تنقید کی عمدہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مزید ملاقاتوں میں اُن کی شخصیت کا ادبی پہلو نکھر کر سامنے آیا۔

ڈاکٹر صاحب سرجن، یعنی آپریشن والے ڈاکٹر ہیں، مگر ان کی تحریر پڑھی جائے یا کسی علمی مسئلے پر گفتگو سنی جائے تو گمان گزرتا ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری انھوں نے اردو ادب میں لی ہے۔ وہ نہایت باریک بین محقق اور مستند نقاد ہیں۔ اُن کی تحقیقی اور تنقیدی رائے کم از کم میرے نزدیک بہت وقیع ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال ہما کی کتاب ''جگنوؤں کے دیس میں'' طباعت کے مراحل میں ہے۔ اُنھوں نے مسودے پر نظر ثانی کے لیے مجھ پر اعتماد کیا۔ کتاب کے دلکش اسلوب کے علاوہ میری نگاہ اُن کی تحریر کے ایک خاص وصف پر مرتکز رہی...... وہ وصف کیا تھا؟؟

ڈاکٹر اقبال ہما کی تحریر میں جگہ جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جو مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی معنی خیز بھی ہوتے ہیں۔ ان جملوں میں کہیں طنز ہے، کہیں مزاح اور کہیں دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ان جملوں کا نمایاں اور بیش قیمت وصف فکر انگیزی بھی ہے۔

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

میں ایسے جملے بار بار پڑھ کر محظوظ ہوتا رہا۔ مجھے ان میں پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، ابنِ انشا اور عطاء الحق قاسمی کی جھلک نظر آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دعویٰ بیکار ہوتا ہے جس کی دلیل نہ ہو۔
''بات ہیرا ہے بات موتی ہے'' میرے مشاہدے اور دعوے کی دلیل ہے۔

میں نے اس مضمون کا نام بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے اور اس میں ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے ایسے ہیرے موتی پیش کیے ہیں جو میری رائے پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

پاکستانی عوام کی ذہنیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (ص:۲۵)
''ہم مقتل کو مزار اور جلاد کو نجات دہندہ سمجھ کر آدابِ بندگی بجا لانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔''
اس جملے کی تحسین کا پورا حق تاریخ اور سیاست کا کوئی منصف اور نکتہ شناس نقاد ہی ادا کر سکتا ہے۔

نصرت دین کے خلوص اور مہمان نوازی کی تعریف ڈاکٹر صاحب کن الفاظ میں کرتے ہیں؟
''مجھے ایک پیشہ ور ڈرائیور کے اتنے غیر پیشہ ورانہ رویّے پر شدید حیرت ہوئی۔ اس ''حماقت'' کے لیے ذرا مختلف قسم کی شخصیت درکار ہوتی ہے۔'' (ص:۴۹)

روپل میں گائیڈ سے ہونے والی تکرار بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں (ص:۶۵):
''مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اصل ''نظام الملک'' نہیں، اُس کا ناتجربہ کار بیٹا ہے۔ اصل ہوتا تو پوری وادی کی سیّاحت کو داؤ پر لگا دیتا، اپنی اکڑی ہوئی گردن سے سریا نہ نکالتا۔''
اس بیان کا اصل لطف اسے ''بلاتبصرہ'' رکھنے میں ہے۔

اپنے گائیڈ ندیم حسین کے ساتھ تکرار کے بعد لکھا جانے والا جملہ ملاحظہ فرمائیں: (ص:۶۵)
''میرے لہجے میں تلخی آ گئی...... اور تلخی پیدا ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔''
معاشرے میں بڑھتی ہوئی عدم برداشت کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے؟

درج بالا اقتباسات قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ معاشرے کے نامعقول رویّے اور اداروں کی تباہ کن ترجیحات...... قاری کو دعوت فکر دے کر خود مصنف ہنستا کھیلتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

ایک چڑھائی پر ہلکا پھلکا مزاح پیدا کرنے کے لیے ٹریکر لڑکی کو ''ٹریکری'' اور دل کی انجیو پلاسٹی کے لیے ''مرمت شدہ دل'' کی دلچسپ ترکیب استعمال کی ہے، بلکہ وضع کی ہے (ص:۷۵)
''نیلی جین میں زبردستی پھنسی ہوئی ''ٹریکری'' مرمّت شدہ دل والے بزرگ سے آگے نکلنے کی کوشش کرے، تو دلِ ناتواں ایک عجب الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ گزرنے دے؟...... نہ گزرنے دے؟...... بس ساتھ ساتھ رکھے۔''

کیا خوب اندازِ بیان ہے۔ کیا خوب مزاح ہے۔ اور خود اپنے آپ پر کتنی گہری طنز ہے۔
ایک جگہ مفتیانِ کرام اور مولویانِ عظام کی تنگ نظری پر نشتر چلایا ہے (ص:۸۴):

"شکر ہے کہ قاسمی صاحب فرقہ پرست مفتی نہیں ہیں، ورنہ گناہِ کبیرہ اور توبہ کی مہلت کے چکر میں نہ پڑتے، توہینِ مذہب کا فتویٰ لگاتے اور پھانسی کے پھندے تک پہنچانے سے پہلے دم نہ لیتے۔"

اس ایک جملے میں ہمارے اُن نام نہاد مفتیوں پر فکر انگیز سوال اُٹھایا ہے جو ہر وقت فتووں کا رجسٹر بغل میں دابے پھرتے ہیں۔

مصنف نے دس بارہ گھروں کی آبادی میں "شیعہ بستی" اور "سنی بستی" الگ الگ بسانے کی وجہ پوچھی تو ندیم حسین نے بتایا کہ اِدھر لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے، سب مل جل کر رہتے ہیں مگر:

"مولوی صاحب تو الگ الگ ہے ناں سر۔ وہ گرما گرمی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے دونوں فرقوں نے مسجد اور بستی تھوڑا دور دور بنایا ہے۔"

اس چھوٹے سے مکالمے میں مذہبی رویے کا بہت بڑا المیہ بیان کیا گیا ہے۔

ایک جگہ اپنی بچگانہ ضد اور ہٹ دھرمی کا جواز کچھ یوں پیش کرتے ہیں (ص: ۱۱۴):

"گدھوں کی رہنمائی میں سفر کیا جائے تو اڑیل پن میں اضافہ ہو ہی جاتا ہے۔"

اس جملے کی جامعیت کتاب پڑھ کر ہی سمجھی جاسکتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: (ص:۱۱۸)

"گدھے بان بھائیوں سے عاجزانہ گزارش ہے کہ گدھے ہانکنے والے ڈنڈے ندی نالوں کے آر پار رکھ کر ہمارا امتحان نہ لیا کریں۔ آپ کے پہاڑی گدھے بے شک اتنے گدھے نہیں ہوتے کہ اِسے پل سمجھ کر عبور کرنے کی کوشش کریں...... مگر میدانی گدھے......؟ ...... اللہ معافی۔"

ایک اور شرارت بھرا جملہ ملاحظہ فرمائیے:

"اور خالی جام جیسی مسرت...... شاہین بھی ہوتی تو اسی میں خوشی گھول کر پی جاتے۔"

سچ بتائیے! ابنِ انشا یاد آیا، یا نہیں؟

ہرلی کوفر بیس کیمپ پر ایک شخص نے یہ کہہ کر تصویر بنانے سے روک دیا کہ تم گروپ فوٹو کے بہانے ہماری خواتین میں دلچسپی لے رہے ہو: (ص: ۱۲۲)۔ ڈاکٹر صاحب کا ردِّعمل دیکھیے۔

"خواتین؟ کہاں تھیں خواتین؟...... کرسیوں پر تفصیلی نگاہ دوڑائی تو انکشاف ہوا کہ اُن کے درمیان واقعی ایک مدھم سی خاتون تشریف فرما ہیں...... اگرچہ وہ بہت زیادہ خاتون نہیں تھیں۔"

یہاں مذکورہ خاتون کی نسوانیت کے حوالے سے ایک ہی جملے میں اس کی شخصیت کو واضح کر دیا ہے۔ اسی موقع پر ایک اور جملہ اور وہ بھی خود کو نشانہ بنا کر (ص: ۱۲۳)

"میں اب اپنی ذاتی خاتون میں بھی دلچسپی لینے سے پہلے کئی بار سوچتا ہوں، تمہاری برائے نام خاتون میں "کیا" لوں گا؟"

اللہ والی جھیل پر لے جانے والے ڈرائیور کے بارے میں لکھتے ہیں: (ص: ۱۳۴)

"نصرت دین ہمارا مزاج سمجھ گیا تھا...... ہم اُس کا مزاج نہیں سمجھ پائے تھے۔"

یہ جملہ نہ صرف خود پر بامعنی طنز ہے بلکہ یہ اعتراف بھی ہے کہ پھول صرف گلزاروں میں نہیں کھلتے، ایک پسماندہ شہر کے ٹیکسی ڈرائیور کا مشاہدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر سے بہتر بھی ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں بعض اشعار کی عمدہ پیروڈی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لکھنؤ کے معرکہ آرا مشاعرے میں پڑھے گئے میر تقی میر کے ایک شعر میں کیا خوب تصرف کیا ہے (ص: ۲۷):

کیا بودو باش پوچھو ہو "نیچے" کے باسیو
فطرت کے شاہکار کو پسماندہ جان کے

درجِ بالا اقتباسات سفر کی روداد سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں، لیکن یہ تحریر کو رواں اور شگفتہ کرنے کے علاوہ معنی خیزی اور فکر انگیزی بھی بخشتے ہیں۔ میرا مقصد ایسے جملوں کی فہرست بنانا نہیں، اپنے اس مشاہدے کا اظہار کرنا ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال ہمانے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور زرخیز ذہن کی بنا پر ایک خاص اسلوب تشکیل دیا ہے جو سفرنامے کو نئی جہت دے سکتا ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
جو پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

ڈاکٹر صاحب کے لیے درازیِ عمر، صحت اور زورِ قلم میں اضافے کی دعائیں۔

اور ان کی نذر یہ قطعہ جو اُن کے اسلوب کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

بات ہیرا ہے بات موتی ہے
بات لاکھوں کی لاج ہوتی ہے
بات ہر بات کو نہیں کہتے
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

ڈاکٹر وسیم عباس

5 نومبر 2025

عرض کیا ہے

عرض کیا ہے کہ یہ سفر نامہ اگر میری دوسری کتابوں سے مختلف نظر آئے تو مجاہد قاسمی صاحب کی ہمراہی کا اعجاز سمجھا جائے۔ میں نے اپنی گذشتہ کتاب میں گزارش کی تھی کہ ڈھلتی ہوئی صحت اور عمر کی وجہ سے کوہ نوردی کو خیر باد کہہ کر فطرت پرستی کے لیے نیا بہانہ تلاش کرنا مجبوری بن گیا ہے۔ فوٹو گرافی کی دنیا میں استادوں کے استاد سمجھے جانے والے مجاہد قاسمی صاحب اکلوتے ہم سفر ہوں تو بہانہ خود بخود مل جاتا ہے۔ لیکن یہ ساتھ اندازِ نگارش میں کچھ تبدیلیوں کا باعث بھی بنا۔ ایک تو یہ کہ نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک روپل فوٹو سیشن میں تبدیل ہو گیا؛ دوسرے یہ کہ سفر کی روداد پر فلمی چھاپ ضرورت سے زیادہ لگ گئی۔ یہ چھاپ پسند نہ آئے تو سنگت کی خرابی سمجھ کر درگزر فرمائیں۔

یاد رہے کہ قاسمی صاحب فلمی دنیا کے انسائیکلو پیڈیا اور راگ اور راگنیوں کے دارالعلوم ہیں۔

کتاب کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ سفر کی روداد میں ادبی رنگ شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو سفر نامے کی بدقسمتی یہ ہے کہ ابتدا میں اسے اصنافِ ادب میں شامل ہی نہیں سمجھا گیا، حالانکہ اردو کا پہلا سفر نامہ بھی ادبی چاشنی کا عمدہ نمونہ ہے۔

یہ صنف اب اردو ادب میں شامل ہے، مگر اپنے شایانِ شان حیثیت حاصل نہیں کر سکی۔

سفر نامہ شروع ہی سے دو اقسام میں تقسیم رہا ہے۔ ایک راہنمائے سفر یا سفری ڈائری، دوسرا سفری داستان۔ سفری داستان میں دورانِ سفر طاری ہونے والے احساسات اور روحانی جذبات کے علاوہ شعر و شاعری، تصوّف، تاریخ، مزاح، سماجی مشاہدات اور باطنی واردات تحریر کی جاتی ہیں۔

اردو سفر نامے کی یہی خوبی اسے دوسری زبانوں کے سفر ناموں سے ممتاز کرتی ہے۔

اس خوبی کے ساتھ اگر اردو زبان کی فصاحت و بلاغت اور ترویج کا مقصد بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو اردو سفر نامہ دو آتشہ ہو کر، ناول اور افسانے سے آگے نہ سہی، اُن کی صف میں باآسانی جگہ بنا سکتا ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی گستاخی ہرگز نہیں کر رہا کہ ان خوبیوں کے حوالے سے سفر نامے کی جھولی بالکل خالی ہے یا سفر نامہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

یوسف خان کمبل پوش کا ''عجائباتِ فرنگ''، مولانا شبلی نعمانی کا ''سیاحت نامۂ یورپ'' اور

محمد حسین آزاد کا ''سفر نامۂ ایران'' کلاسیکی ادب اور فصاحت و بلاغت کے شاہکار ہیں۔

اُن کے بعد خواجہ احمد عباس کا ''مسافر کی ڈائری''، ابنِ انشا کا ''چلتے ہو تو چین کو چلیے''، محمود نظامی کا ''نظر نامہ'' اور اشفاق احمد کا ''سفر در سفر'' اردو ادب کا اثاثہ ہیں۔

جناب مستنصر حسین تارڑ اپنی ذات میں خود ایک ادارہ ہیں، کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

جناب عطاء الحق قاسمی، جناب علی سفیان آفاقی اور جناب جمیل الدین عالی نے بھی اردو سفر نامے کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

دورِ جدید میں رضا علی عابدی، محترمہ سلمیٰ اعوان، ڈاکٹر انور سدید، بیگم اختر ریاض الدین، قمر علی عباسی اور حمزہ فاروقی کا شمار مستند اور معروف سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

اتنے جیّد اسمائے گرامی کے سامنے اس ناچیز کی کیا اوقات ہے کہ سفر نامے کے اندازِ نگارش میں کمی کوتاہی پر بات کرے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ بہتری کی گنجائش ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔

میری ناقص رائے میں سفر نامے کے حوالے سے بہتری کی سب سے زیادہ گنجائش اردو املا اور جملے کی ساخت کے باب میں ہے؛ اور شاید دوسری اصناف میں بھی ہے۔ میں اس قابل نہیں اور میرے قارئین کا حلقہ بھی اتنا وسیع نہیں کہ اس باب میں کوئی خدمت سرانجام دی جا سکے۔

نامور اور بااثر سفر نامہ نگاروں کی خدمت میں گزارش ہے کہ نئے لکھنے والوں کی راہنمائی کے لیے کوئی سوشل میڈیا فورم تشکیل دیجیے۔ ادب کی دیگر اصناف سے پہلے اگر سفر نامہ اردو زبان کی خدمت کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے، تو اِس صنف کے اہلِ قلم کے لیے باعثِ افتخار بن سکتا ہے۔

اس کتاب کے مسوّدے پر نظرِ ثانی اور اصلاح کے لیے گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج وہاڑی کے پروفیسر ڈاکٹر وسیم عباس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اُن کی عنایت اور انہاک نے زبان و بیان کی درستی میں معاونت فرمائی۔ وادیِ نیلم کے دانشور اور اہلِ علم جناب عبدالبصیر تاجور کا خصوصی شکریہ۔ وہ کتاب کی تصنیف کے دوران مسلسل رابطے میں رہے اور اردو املا کے حوالے سے بیش قیمت اور منطقی مشوروں سے نوازتے رہے۔ ڈاکٹر ہادیہ اقبال پی جی چغتائی لیب لاہور کا شکریہ، کہ مسوّدے کی اوّلین پروف ریڈنگ انھوں نے کی...... جزاک اللہ الخیر

ڈاکٹر محمد اقبال ہما

وہ بہتے جھرنے، یہ نیلے پانی، پہاڑ ہم کو پکارتے ہیں

ہزارہ موٹروے......نازاں سانچی......شاہراہِ قراقرم......آدابِ غلامی......استور

فطرت کا بلاوا کوئی شاعرانہ تخیل یا ادبی محاورہ نہیں، ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے جو بار بار اپنی صداقت ثابت کرتی رہتی ہے۔

صحت کے مسائل نے مجھے ٹریکنگ جیسے محبوب مشغلے سے سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

مگر کچھ فطرت کدے دل میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ موسمِ بہار آتے ہی مچل اُٹھتے ہیں:

''رُک سیک اٹھاؤ اور چلے آؤ۔''

اِنھیں دل نشینوں میں سے ایک کا نام ہے......نانگا پربت روپل فیس بیس کیمپ

میں نے اس ٹریک کے لیے وہاڑی ٹریکرز کے اراکین کو ورغلانے کی بھرپور کوشش کی، مگر وہ چند روز پہلے ہی چترال اور کمراٹ کا چکر لگا آئے تھے۔ چپ کر کے ''ڈڑوٹ گئے''۔ کوئی جواب نہ دیا۔

اسی دوران مجاہد قاسمی صاحب نے اپنے دوست راجا نثار احمد کے ترتیب دیے ہوئے تفریحی سفر میں شمولیت کی دعوت دی جو راما جھیل، روپل گاؤں، برزل پاس، منی مرگ اور دیوسائی پر مشتمل تھا۔

منی مرگ کی رین بو جھیل بھی دل میں بسی ہوئی تھی، اس لیے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔

ٹریک اب تفریحی سفر بن گیا تھا۔ اس لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

وٹس ایپ پر ملنے والے پروگرام کے مطابق میں نے سکائی ویز بس سروس میں اسلام آباد کے لیے نشست مخصوص کروالی۔ وہاڑی سے روانگی رات گیارہ بجے ہوئی۔ آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ مجاہد قاسمی صاحب کا فون آ گیا اور انھوں نے بڑے سکون سے دھماکا خیز اعلان کر دیا۔

''ڈاکٹر جی ابھی سفر شروع نہیں کیا تو زحمت نہ کریں، کر لیا ہے تو واپس تشریف لے جائیں۔ ہمارا ٹور پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔

''سر جی کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ جانتے بھی ہیں کہ اتنی خوفناک خبر سن کر گھر سے نکل آنے والوں کے دل پر کیا گزرتی ہے؟''

قاسمی صاحب نے اتنی سرد آہ بھری کہ میرا سیل فون ٹھنڈا پڑ گیا۔

''مجبوری ہے ڈاکٹر جی۔ کراچی والے وعدہ کر کے مکر گئے، گروپ ٹوٹ گیا۔''

''مکڑا پیک کا ناکام ٹریک یاد کریں۔ میں تے میرا ڈھولن ماہی......ٹریک تے دو ویں راہی۔''

''کچھ خدا کا خوف کریں ڈاکٹر جی۔ پروگرام منسوخ ہونے کی خبر سن کر بیگم صاحبہ کے چہرے پر اچھا خاصا نور اُتر آیا ہے۔ اب اگر کوئی اور پروگرام بنا لیا تو رُخِ زیبا پر بارہ بج جائیں گے۔''

''تو پھر محمد رفیع سے سفارش کروالوں؟''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' قاسمی صاحب نے گویا نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

''بس میں بیٹھا ہوا ہوں۔ بلند آواز میں کوشش نہیں کر سکتا۔ وٹس ایپ پیغام دیکھیں۔''

میں نے پیغام بھیج دیا۔

جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا......روکے زمانہ چاہے روکے لُگائی......تم کو جانا پڑے گا

پیغام دے کر میں سوچنے لگا کہ فطرت کے اشارے پر اگر وادیِ روپل اور منی مرگ کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے تو اب کون سا فطرت کدہ بلا رہا ہوگا؟

دل نشیں ارمانوں نے صدا لگائی۔ نانگا پربت روپل فیس بیس کیمپ

منی مرگ جیپ ٹریک ہے اور یہ شوق کسی بھی وقت پورا کیا جا سکتا ہے۔ دل کے ''گڑبڑ'' والے معاملات خبردار کر رہے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک دشوار سے دشوار تر ہوتا جائے گا۔ میں نے پچھلے سال بھی قاسمی صاحب کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چند سال پہلے یہ ٹریک کر چکے تھے۔ کنّی کترا گئے۔ اب اُن کے دوستوں کی وجہ سے پروگرام منسوخ ہوا تھا، تو اس ''جرم'' سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہوتی۔ میں نے پیغام میں ترمیم کر دی:

''صرف جانا نہیں پڑے گا۔ روپل فیس بیس کیمپ جانا پڑے گا۔''

قاسمی صاحب کی طرف سے پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔

بس نے سیال موڑ پر وقفہ کیا۔ میں نے انھیں فون کیا اور روپل فیس بیس کیمپ ٹریک کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ نخرے وخرے دکھانے کے بعد مان گئے۔

ان کی آمادگی میں سلیپنگ بیگ اور خیمہ فراہم کرنے کا وعدہ بھی شامل تھا۔

میں گھر سے تفریحی سفر کے لیے نکلا تھا اس لیے ٹریکنگ کا سامان نہیں لایا تھا۔

نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک منظور ہوتے ہی سفر ایک مرتبہ پھر خوشگوار لگنے لگا۔

میں نے صبح چھ بجے قاسمی صاحب کے دولت خانے پر دستک دی۔

نہا دھو کر تازہ دم ہونے اور ناشتا کرنے کے بعد استور کے لیے ٹرانسپورٹ کی تلاش ہوئی۔

سپیشل ٹیکسی کا سفر بہت مہنگا تھا اور سواری کے حساب سے کار دستیاب ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے دفاتر کا چکر لگایا تو یہ سن کر شدید مایوسی ہوئی کہ اگلے دو روز تک استور کے لیے کوئی نشست دستیاب نہیں۔ ناردرن ایریا ٹرانسپورٹ (NATCO) کی گلگت یا سکردو جانے والی بسوں سے بھی امید باندھی، مگر اِن کی صورتِ حال استور سے بدتر نکلی۔

گلگت کے لیے فیصل موورز کی بسیں بھی چلتی ہیں۔ اُن کے بکنگ آفس سے رابطہ کرنے پر بتایا گیا کہ اس وقت کوئی نشست خالی نہیں۔ کل شام ساڑھے پانچ بجے بس روانہ ہوگی تو جگہ ملنے کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ مخصوص کروائی گئی چند نشستوں کا کرایہ ابھی تک جمع نہیں ہوا۔

ہم اگلے روز شام پانچ بجے فیصل موورز کے بس سٹاپ پر پہنچ گئے۔ کاؤنٹر کلرک نے خوش خبری سنائی کہ سیٹ نمبر ایک اور دو کے مسافر ابھی تک نہیں آئے۔ اُن کے ٹکٹ کی رقم بھی جمع نہیں ہوئی۔ ہم اگر جگلوٹ کی بجائے گلگت کا کرایہ ادا کر دیں تو یہ نشستیں ہمیں مل سکتی ہیں۔

کرائے کو گولی ماریں جی۔ ناامیدی کی حالت میں فرنٹ سیٹ کی دستیابی!

یہ اگر فطرت کی طرف سے نانگا پربت روپل فیس بیس کیمپ کا بلاوا نہیں تو اور کیا تھا؟

بہار موسم میں سبز پتے ہمارا گلشن نکھارتے ہیں
وہ بہتے جھرنے، یہ نیلے پانی، پہاڑ ہم کو پکارتے ہیں

فیصل موورز کی بس اسلام آباد کے سٹی ٹرمینل سے شام پونے سات بجے روانہ ہوئی۔

بس کی ظاہری حالت اطمینان بخش تھی مگر نشستیں اس قدر غیر آرام دہ تھیں کہ لگتا تھا یہ وہی ماڈل ہے جو فیصل موورز کے افتتاح کے وقت سڑک پر اُتارا گیا تھا۔ لاہور اسلام آباد روٹ سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اب اسے شاہراہِ قراقرم پر ڈالا گیا ہوگا۔

یہ شاہراہ گاڑیوں کے ساتھ ساتھ سواریوں کے بھی انجر پنجر ڈھیلے کرنے کے لیے بدنام ہے۔

گلگت بلتستان کی سمت تقریباً ہر سال سفر ہوتا ہے۔

کبھی ٹریک کے لیے، کبھی موسمِ بہار کے لیے اور کبھی ہنزہ یا سکردو کی خزاں کے لیے۔

یہ سفر عام طور پر دوستوں کے گروپ کے ساتھ کار پر کیے جاتے ہیں اور چلاس جانے کے لیے وادیِ کاغان، ناران اور بابوسر ٹاپ کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس راہ میں فطرت کی رنگینیاں قدم قدم پر دل بہلاتی رہتی ہیں اور طویل سفر آسانی سے گزر جاتا ہے۔ کسی وجہ سے اگر رات کا قیام کرنا پڑ جائے تو بٹہ کنڈی اور بڑوئی بہترین سٹاپ ہیں۔

بابوسر ٹاپ صرف چھوٹی گاڑیوں کے لیے کھلتا ہے۔ اس لیے گلگت یا سکردو جانے والی بسیں تھاکوٹ، بشام اور داسو سے گزرتی ہوئی چلاس پہنچتی ہیں۔ یہ راستہ کبھی بابوسر ٹاپ کی نسبت چار سے چھ گھنٹے زیادہ لیتا تھا۔ ہزارہ موٹروے بننے کے بعد دس گھنٹے کا سفر چار سے پانچ گھنٹے میں نمٹ جاتا ہے۔

آج کل بشام اور بابوسر ٹاپ کے راستے میں صرف دو سے تین گھنٹے کا فرق رہ ہے۔

ہزارہ موٹروے کی دل کشی نے اسلام آباد سے بشام تک کے سفر کو کسی حد تک رنگین بنا دیا ہے۔

میں نے اپنے سفرنامے ''نیلم کے ساتھ ساتھ'' میں اس شاہراہ کی جمالیاتی طرزِ تعمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر دن کی روشنی میں سفر کیا جائے تو یہ شاہراہ بذاتِ خود ایک تفریح ہے۔

ہم نے اس کے بیش تر حصے پر رات کی تاریکی میں سفر کیا، لہٰذا مناظر کی بجائے دونوں جانب جھلملاتی روشنیوں پر تبصرے سے دل بہلاتے رہے۔

بس ڈرائیور نے فیصل موورز کے مانسہرہ ٹرمینل پر تقریباً تیس منٹ کا وقفہ کیا اور وہاں سے نکلتے ہی ایک ڈھابے کے سامنے رُک کر کھانے کا اعلان کر دیا۔

فیصل موورز کے ڈرائیور وردی پر پائلٹ کا بیج لگاتے ہیں، مگر پائلٹ بن نہیں جاتے۔ ایک پلیٹ قورمے اور چند ٹکے کمیشن کے لالچ میں مسافروں کو جیب کتروں کے چنگل میں پھنسا دیتے ہیں۔

ڈھابے میں بے ذائقہ دال کی ننھی منّی اور بیف کی چُنّی منی پلیٹ کا بل ساڑھے آٹھ سو روپے بتایا گیا۔ میں نے ایک ہزار کا نوٹ دیا۔ کاؤنٹر والے نے دراز میں جھانکتے ہوئے پوچھا:

''پچاس روپے کھلے ہیں؟''

''جی نہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر۔ آپ کا بل پورے نو سو روپے بنتا ہے۔'' اُس نے سو کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟ بل میں اضافہ اس لیے ہوگیا کہ میرے پاس پچاس روپے کھلے نہیں ہیں؟''

’’بل میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ حساب کتاب میں غلطی تھی۔ وہ ٹھیک کر دی گئی ہے۔‘‘

بات پچاس روپے کی نہیں تھی، اخلاقیات کی تھی۔

اور اخلاقی تھکن سفر کی تھکن سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

مانسہرہ سے روانہ ہونے کے تقریباً دو گھنٹے بعد ہم بشام پہنچ گئے۔

ہزارہ موٹروے نے یہ سفر مختصر تو کر دیا ہے، مگر کچھ چٹ پٹی دلچسپیاں چھین لی ہیں۔

ہری پور انٹرچینج کا بورڈ دیکھتے ہی سرائے صالح کے ’’سلیم ترکی پکوڑے‘‘ یاد آ جاتے ہیں۔

اپنی گاڑیوں پر سفر کرنے والے یہاں لازمی رکتے، پبلک ٹرانسپورٹ والے بھی ڈرائیور سے ’’پکوڑا سٹاپ‘‘ کی درخواست کیے بغیر نہ رہتے۔ دکان کی دیواروں پر مشہور فلمی اداکاروں کے ساتھ دکان کے مالک سلیم کی تصویریں اور ترکی اداکارہ نازاں سانچی کی فل سائز پورٹریٹ آویزاں تھی۔

روایت ہے کہ نازاں ساںچی نے بل ڈھیری ریلوے اسٹیشن پر ایک فلم کی شوٹنگ میں حصہ لیا۔ واپسی پر سرائے صالح کے قریب ایک دکان پر اُسے پکوڑے نظر آئے جو ترکی کے کسی پکوان سے مشابہ لگے۔ اُس نے عام لوگوں کے ساتھ دکان کے سامنے کھڑے ہو کر پکوڑے تناول فرمائے اور فوٹو گرافرز کو تصویر کھینچنے سے منع کر دیا...... خبر مگر اُڑ چکی تھی۔

اگلے روز نازاں ساںچی اور پکوڑوں کی پلیٹ فلمی صفحات کی زینت بن گئیں۔

اُن دنوں وادیِ مانسہرہ اور گردونواح فلموں کی شوٹنگ کے لیے بڑے مقبول علاقے تھے۔ سرائے صالح سے گزرتے ہوئے بیش تر اداکار اور اداکارائیں نازاں ساںچی کے عوامی انداز کی پیروی کرنے لگیں۔ سلیم نے مشہور اداکاروں کے ساتھ تصویریں بنوا کر دیواروں پر لگا دیں اور تُرکی اداکارہ کی یاد میں اپنی دکان کا نام سلیم ترکی پکوڑے رکھ دیا۔

لالی وُڈ، جو کبھی بالی وُڈ کو ٹکّر دیتی تھی، مولا جٹ اور نوری نت کے گنڈاسے سے کاٹ ڈالی گئی۔

سرائے صالح کے ترکی پکوڑے موٹروے کے ہاتھوں ٹال ٹیکس کی طرح کٹ گئے۔

قلندر آباد کے چپل کباب، چھتر پلین کی ایکسٹرا رِچ کافی اور بٹ گرام کے گجر ملوک ڈھابے کا دنبہ کڑاہی...... اب بھولی بسری خوش ذائقہ یادوں کا حصہ ہیں۔

میں نے جب پہلی مرتبہ فیری میڈوز کے لیے شاہراہِ قراقرم پر سفر کیا تو بشام سے چلاس تک کے سنگلاخ راستے کو قدرت کے چٹانی عجائب گھر کا نام دیا۔ آج کل یہ عجائب گھر اپنی خستہ حالی کی وجہ سے

مصائب گھر بن چکا ہے۔ بشام سے آگے بائیں جانب نظر آنے والا پتن آبشار، کھنڈر نما پہاڑی نالے میں بدل گیا ہے اور سمر نالے کی فطری دل کشی بے ترتیب ڈھابوں کے جنگل میں گم ہو گئی ہے۔

مجاہد قاسمی صاحب نے راولپنڈی میں فرمایا تھا کہ بشام سے آگے شاہراہِ قراقرم دوبارہ تعمیر کی گئی ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے۔ اُنھیں شاید علم نہیں تھا:

’’کہ اس تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی‘‘

اور وہ صورت سڑک چوڑی کرنے کے لیے پہاڑوں کو بارودی دھماکوں سے اُڑانا ہے۔

ان دھماکوں نے پہاڑوں کی جڑیں ہی کھوکھلی نہیں کیں، اُن کا دل چیر دیا، جگر چھلنی کر دیا اور روح پر اتنے گہرے زخم لگائے جو کبھی بھر نہیں سکتے۔ چنانچہ اِدھر تعمیر کی صورت بنتی ہے اُدھر لینڈ سلائیڈنگ اسے بگاڑ دیتی ہے۔ شاہراہِ قراقرم کی مرمت شدہ حالت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی۔

چینی کھلونوں کی طرح چینی منصوبے بھی کیا کم نازک ہیں؟

ذرا سی ٹھیس لگتے ہی تڑق کر کے ٹوٹ جاتے ہیں۔

وادیِ نیلم کے دانشور جناب عبدالبصیر تاجور اس معاملے میں مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرہ سے خاصے متاثّر ہیں۔ اُن کی تحقیق کے مطابق ہری سنگھ نے جب کشمیر اور جموں کے درمیان سڑک کی تعمیر کا ٹھیکا ایک غیر ملکی کمپنی کو دیا، تو یہ شرط عائد کر دی کہ سڑک پہاڑوں کے پہلو ’’کاٹ‘‘ کر بنائی جائے۔ بارودی دھماکے کر کے پہاڑ کے ساتھ عوام کے پرخچے اُڑانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

ہری سنگھ ’’اپنے غلاموں‘‘ کی جان کو ڈالرز سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا اور فطرت کی جغرافیائی ساخت کو ریاست کے مالی مفاد پر قربان کرنا پسند نہیں کرتا تھا...... پگلا کہیں کا!

ہمارے وزیرِ خزانہ ہوتے تو ہری سنگھ کو سمجھا بجھا کر ’’سیدھی راہ‘‘ پر لے آتے۔

’’حضور! پہاڑ تو تھوڑے بہت بچ ہی جائیں گے، عوام نہ بچے تو بجٹ بنانے میں آسانی رہے گی۔‘‘

ہری سنگھ نے شاید کسی دانشور کا یہ قول سن رکھا تھا:

’’سڑکوں کی حالت کسی قوم کے ظاہری اور باطنی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔‘‘

شاہراہِ قراقرم کے کوہستانی حصّے کی سدا بہار خجل خواری اس قول کی صداقت ثابت کرتی ہے۔

قوم کا اجتماعی شعور اگر اسی طرح بوٹوں کے دھماکوں تلے دم توڑتا رہا تو ایشیا کا ٹائیگر ایک دن ایسا میمنا بن جائے گا جسے جو چاہے، جب چاہے شکار کر لے۔

اللہ کرے ''بے وقوف دانشور'' کا یہ قول محض شگوفہ ثابت ہو۔

قوموں کی حالت بدلنے کے لیے اتنی ہی مسلسل جدوجہد درکار ہے جتنی شاہراہِ قراقرم کی مرمّت کے لیے درکار رہتی ہے۔ قیام کے وقت سجدے میں گرنے سے کوئی شعور بیدار نہیں ہوتا۔

سفری بیان کچھ زیادہ سنجیدہ ہو رہا ہے۔ آیئے سمر نالے پر چائے کا وقفہ کر لیتے ہیں۔

اس فطرت کدے کا ظاہری حسن بُری طرح پامال کر دیا گیا ہے، مگر بہتے پانیوں کی سرگوشیوں سے پھوٹتے نغمے اب بھی سفر کی تھکن بھلا دیتے ہیں۔

کڑک چائے نے ڈرائیور کے ذوقِ سماعت میں بھی تازگی پیدا کر دی تھی۔ اُس نے لمبے عرصے سے بجنے والے اوٹ پٹانگ گانے بند کر کے مہدی حسن کی غزل چلا دی۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے...... یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

اپنی پسندیدہ غزل سن کر میں نے شرارتاً تبصرہ کیا:

''محمد رفیع سو بار جنم لے کر بھی میر کی یہ غزل اتنے پُرسوز انداز میں نہیں گا سکتا۔''

مجاہد قاسمی صاحب دل و جان سے محمد رفیع کے شیدائی ہیں۔ فوراً سنجیدہ ہو گئے۔

میری یہ شرارت رائیگاں نہ گئی۔ مہدی حسن صاحب محمد رفیع کے مقابلے پر آئے تو سمر نالے سے نانگا پربت ویو پوائنٹ تک کا سفر نہایت آسانی سے کٹ گیا۔ درمیان میں بیگم اختر، شمشاد بیگم، نور جہاں، لتا، سمن کلیان پور، مسعود رانا اور مجیب عالم بھی کچھ نہ کچھ سناتے رہے۔

قاسمی صاحب نے اپنی پسند کے ثبوت میں محمد رفیع کی چند غزلیں گا کر بھی سنائیں۔ میں اُنھیں آواز نیچی رکھنے کی تلقین کرتا رہا۔ اگلی نشست پر نقاب پوش خاتون کے پہلو میں طالبان پوش حضرات تشریف فرما تھے۔ اُن میں سے کسی کو غلط فہمی ہو جاتی تو بیٹھے بٹھائے مہابھارت برپا ہو سکتی تھی۔

شاہراہِ قراقرم کا ایک خاص تحفہ جگلوٹ سے چند کلومیٹر پہلے تھا یعنی ویو پوائنٹ ہے۔ یہاں نانگا پربت اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ بس نے یہاں کچھ دیر وقفہ کیا۔

قاسمی صاحب کا فرمانا تھا کہ اس جگہ نانگا پربت کا جلوہ اُس حسینہ جیسا ہے جو دور کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی اپنا دیوانہ بنا لیتی ہے۔ اس وقت حسینہ گھنگھور گھٹاؤں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی۔ پوری کوشش کے باوجود بے حجاب نہ ہو سکی...... ہم مایوس ہو کر بس میں بیٹھے اور جگلوٹ پہنچ گئے۔

جگلوٹ سے استور کے لیے مختلف قسم کی پبلک ٹرانسپورٹ چلتی ہے۔ اس وقت صرف ٹیکسی

دستیاب تھی جو فی سواری ایک ہزار روپے طلب کر رہی تھی۔ ٹائم پر لگی ہوئی ٹیکسی کی فرنٹ سیٹ پر ایک نوجوان پہلے ہی سے تشریف فرما تھا۔ ہم عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ایک سواری اور مل گئی تو سفر شروع ہو جائے گا۔ میں نے ڈرائیور کو پیش کش کی کہ ہم تین سواریوں کا کرایہ دے دیتے ہیں، وہ سفر شروع کر دے۔ اُس نے یہ بتا کر پریشان کر دیا کہ عقبی نشست پر چار افراد ''ٹھونسے'' جائیں گے۔

ہم پریشان ہو گئے۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ ہم آغوش ہو کر سفر کرنا آسان کام نہیں۔

ہمارے پاس تو مدنی تکیہ بھی نہیں تھا۔

ہم نے ٹیکسی سے اترنے کا فیصلہ کر لیا۔

قاسمی صاحب کا خیال تھا کہ دس بجے گلگت سے استور کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ چلنا شروع ہو گی تو کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام آباد سے استور آنے والی کوئی بس آ جائے اور ہمیں اُس میں جگہ مل جائے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ڈرایا کہ بسیں اور ہائی ایس گلگت ہی سے ''سیٹو سیٹ'' ہو کر چلتی ہیں، اُن میں جگہ ملنے کا کوئی امکان نہیں۔

قاسمی صاحب اُس کے جھانسے میں نہ آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ استور پہنچنے کے بعد ہماری آج کی مصروفیت آرام؛ اور صرف آرام ہے۔ چند گھنٹوں کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ جگلوٹ کی فوٹو گرافی کا موقع مفت میں مل جائے گا...... وقت کی تنگی جگہ کی تنگی سے بہر حال بہتر ہے۔

ہم گاڑی سے اتر کر ڈکی سے سامان نکالنے لگے تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پیش کش کر دی کہ ہم تینوں مل کر پانچ سواریوں کا کرایہ دے دیتے ہیں۔ اس طرح سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہمیں نوجوان کی بے لوث قربانی نے بہت متاثر کیا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اُسے عقبی نشست کی تین یا چار سواریوں سے کیا فرق پڑتا تھا؟ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ اُسے استور پہنچنے کی جلدی ہو۔

ہم نے بہر حال اچھا گمان رکھا کہ اُس نے سات سو روپے کا نقصان صرف ہماری سہولت کی خاطر برداشت کیا ہے۔ اس لیے خلوصِ دل سے نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔

اُس نے قاسمی صاحب کی بزرگی کا احترام کرتے ہوئے فرنٹ سیٹ اُنھیں پیش کر دی اور خود عقبی نشست پر آ گیا۔ یہ اُس کی ''نیک نیت قربانی'' کا ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔

مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اُس نے قاسمی صاحب کو مجھ سے زیادہ بزرگ سمجھا۔

نوجوان سے تعارف کے بعد علم ہوا کہ وہ پاک فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز ہے اور آج

کل چلم چوکی پر فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

تعارف سن کر حیرت ہوئی۔ میں نے اتنا دھان پان کپتان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نوجوان نے بتایا کہ اُس کی رہائش ملتان میں ہے۔ چونکہ وہاڑی ملتان ڈویژن کا ضلع ہے، اس لیے فوجی اصطلاح میں ہم اُس کے گرائیں ٹھہرے۔ مزید تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ میرے نشتر میڈیکل کالج کے ہم جماعت ڈاکٹر انوار الحق کا بھانجا اور ایف ایس سی کے ہم جماعت فاروق احمد کا پڑوسی ہے۔

اس تعلق نے ماحول کو قدرے بے تکلف بنا دیا۔ ہمارے نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک کے بارے میں سن کر اُس نے مشورہ دیا کہ موقع ملے تو کنکارڈیا ضرور جائیں۔ وہاں سے کے۔ٹو سمیت چار ایسی چوٹیوں کا منظر دیکھا جا سکتا ہے جو آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہیں۔

’’آپ نے یہ ٹریک کیا ہوا ہے؟‘‘ میں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

’’ٹریک نہیں کیا۔ کنکارڈیا میں دو سال ڈیوٹی دی ہے۔‘‘

’’آپ کنکارڈیا ہی میں تعینات تھے یا سیڈل پیک کی سرحدی چوکی پر؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’آپ ان فوجی چوکیوں سے واقف ہیں؟ یعنی کنکارڈیا ٹریک کر چکے ہیں؟‘‘ ہمیں حیران کرنے کے چکر میں کپتان صاحب خود حیران ہو گئے۔

’’ہم کنکارڈیا اور غونڈوغورو لا عبور کر کے وادیٔ ہوشے میں اُتر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ٹریک پر کتاب بھی لکھی ہے۔ موقع ملے تو ضرور پڑھیں۔ آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور یادیں تازہ ہو جائیں۔‘‘ قاسمی صاحب نے کپتان صاحب کو مزید حیران کرنے کی کوشش کی۔

’’تھینک گاڈ۔ میں سوچتا تھا کہ کب کوئی ایسا شخص ملے جس کے ساتھ سیڈل پیک پوسٹنگ کی روداد شیئر کر سکوں۔ اُس شدید برفیلے علاقے میں ڈیوٹی کے دوران پیش آنے والے واقعات پر اکثر لوگ یقین نہیں کرتے۔ میرے قریبی دوست بھی انھیں من گھڑت کہانیاں سمجھتے ہیں۔ میں آپ کی کتاب ضرور پڑھوں گا۔ کتاب کا نام کیا ہے؟‘‘ کپتان صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔

’’کے۔ٹو۔ برفانی وادیاں۔ نیٹ سے آپ کو پی ڈی ایف ورژن مل جائے گا۔‘‘

اس کے بعد کپتان صاحب بلا تکان بولتے گئے اور برسوں کا جمع کیا ہوا غبار نکالنے لگے۔ انھیں علم تھا کہ سامعین پوری دلچسپی سے سنیں گے اور یقین بھی کریں گے۔

سُمر نالے سے جگلوٹ تک کا سفر مجاہد قاسمی صاحب کے ساتھ شرارت کے نتیجے میں آسان ہوا

تھا، استور کا آدھا سفر کپتان صاحب کی دلچسپ باتوں میں کٹ گیا۔

کنکارڈیا پر تعیناتی کے دوران وہ گیشا بروم اوّل اور براڈ پیک پر کوہ پیمائی کے لیے آنے والی ٹیموں کے رابطہ افسر رہے تھے۔ اسی لیے ’’کوہ پیمانیوں‘‘ کی بہت سی رنگین و سنگین داستانوں کے چشم دید گواہ تھے۔ ان برف پوش حسیناؤں کے پرستار پہلی مرتبہ اُن کے ہتھے چڑھے تھے۔ انھوں نے ان چوٹیوں پر مہم جوئی کی حکایت چھیڑ دی۔ بس پھر کیا تھا...... ہمیں لگا کہ استور گورج میں نہیں، یادوں اور مشاہدوں کے کسی رنگین افق پر سفر کر رہے ہیں۔ کنکارڈیا کہانی براڈ پیک اور گیشا بروم اوّل کے بیچ گردش کر رہی تھی اور کپتان صاحب اسے چوٹی تک پہنچانے سے پہلے دم لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

ہم نے گیشا بروم اوّل پر میڈم نائلہ کیانی اور براڈ پیک پر براڈ بوائے شہروز کاشف کی مشترکہ مہم کا ذکر چھیڑا۔ یہ ریکارڈ ساز شخصیات آج کل کوہ پیمائی کی ہاٹ پیسٹری اور ہاٹ کیک سمجھی جاتی ہیں۔ ہمیں مختلف تقریبات میں ان کے ساتھ ملاقات اور تھوڑی بہت گپ شپ کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے کوہ پیمائی کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔ کپتان صاحب نے اس باب میں مسکراہٹ کے سوا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ غیر ملکی کوہ پیما ٹیموں کے چھلکتے ہوئے جام اور اُن کے بعد لنڈھائی جانے والی ہمہ جہت ’’فراخ دلی‘‘ پر چسکے لے لے کر روشنی ڈالی۔ میں نے ہمہ جہت فراخ دلی سے ذاتی استفادے کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے اس داستان کی پوشیدہ رنگینی بھی معنی خیز خاموشی میں لپیٹ کر پیش کر دی۔

کپتان صاحب کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو ہماری باری آئی۔

ہم نے فوج اور عوام کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی اور تناؤ پر گفتگو کرنے کی کوشش کی۔

کپتان صاحب نے اس موضوع پر ذاتی رائے دینے سے گریز کیا اور انتہائی محتاط رویہ اپناتے ہوئے ایک سنی سنائی ’’درباری‘‘ تقریر کا حوالہ دے کر بات ختم کر دی۔

’’آپ لوگوں کو عوامی ردِعمل سے کسی قسم کا خوف نہیں کھانا چاہیے۔ اِن کے جذبات کا طوفان ہمیشہ چند دنوں میں اُتر جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عدالتی قتل اور جلاوطنی جیسے واقعات کا ردِعمل بھی کچھ عرصے بعد بھولی بسری داستان بن گیا۔ آپ کو یقین رکھنا چاہیے کہ یہی عوام بہت جلد سب کچھ بھول بھال کر ایک بار پھر آپ لوگوں پر پھول پتیاں نچھاور کرنے لگے گی۔‘‘

کپتان صاحب کی مہربانی تھی کہ انھوں نے عوام سے پہلے کوئی صفت لگانا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کمی اُن کی معنی خیز نظروں نے پوری کر دی۔ درباری خطاب کے تاریخی حوالے سو فیصد درست مگر

اَدھورے تھے۔انھیں پورا کرنے کے لیے کچھ ''شرمناک'' اعترافات ضروری ہیں۔

ہم اطاعت کے مجدّد اور غلامی کے ایسے امام ہیں، جو وطن کا بازو کاٹنے والوں اور جمہوریت کا سر قلم کرنے والوں کے سینے پر بہادری کے تمغے سجا کر دفن کرنے پر خاموش تماشائی بن سکتے ہیں۔

ہم مقتل کو مزار اور جلاد کو نجات دہندہ سمجھ کر آداب بندگی بجالانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہم سب کچھ بھول بھال کر پھول پتیاں نچھاور کرنے میں بھی فخر محسوس کریں گے۔مطمئن رہیں۔

زمانے، رویّے اور جذبات بہت تیزی سے بدلتے ہیں۔لڑکپن میں ترچھی ٹوپی دیکھتے ہی سلیوٹ مارنے کو دل کرتا تھا۔بڑھاپے میں بھی مارنے کو دل کرتا ہے......مگر کیا؟

کپتان صاحب کی مسکراہٹ نے مستقبل کے خطرات کی جھلک دکھا دی تھی۔

مناسب یہی تھا کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے استور ویلی روڈ پر توجہ دی جائے۔

استور، جگلوٹ سے ترسیٹھ کلومیٹر اور شاہراہِ قراقرم سے چوالیس کلومیٹر فاصلے پر واقع ہے۔

اسلام آباد سے اپنی ٹرانسپورٹ پر آنے والے جگلوٹ نہیں جاتے، جگلوٹ سے اٹھارہ کلومیٹر پہلے استور ویلی روڈ پر مڑ جاتے ہیں۔یہ موڑ چند سال پہلے تک غیر محسوس انداز میں گزر جاتا تھا۔

اب اس سہ راہے پر یادگاری مینار بنا کر رہنما بورڈ نصب کر دیے گئے ہیں۔

دریائے استور کے ساتھ ساتھ سفر کرنے والی استور ویلی روڈ شروع شروع میں خوش آمدیدی سڑک لگتی ہے۔جوں جوں آگے بڑھتے جائیں خوار آمدیدی پیغامات آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ تبدیلی فطرت پسندوں کے دل میں امید کی کرن بھی جگاتی ہے۔

وہ بخوبی جانتے ہیں کہ فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے خوار ہونا شرط ہے۔

راستے آسان ہو جائیں تو فطرت کدوں کا حسن ماند پڑنے لگتا ہے۔

استور ویلی روڈ ڈبل یوٹرن لیتی ہوئی نشیب میں جا کر دریائے سندھ پر بنا ہوا تھاپیچی پل عبور کرتی ہے۔تھاپیچی پل سے آگے دریائے استور اور تھاپیچی نالا دریائے سندھ میں شامل ہوتے ہیں۔

اس سنگم کے بعد دریائے سندھ کا وسیع پاٹ چھوٹی سی جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ڈرون کیمروں سے لی گئی تصویروں میں استور ویلی روڈ کا ڈبل یوٹرن، دریائے سندھ پر بنایا گیا تھاپیچی پل اور پس منظر میں نانگا پربت کی برف پوش چوٹیاں انتہائی خوب صورت منظر پیش کرتی ہیں۔

گاڑی کی کھڑکی سے جھانکنے والا ''نواں پروہنا'' حیران ہوتا ہے کہ وی لاگ میں نظر آنے والی

استور روڈ کی افسانوی دل کشی......کہاں ہے......کس طرف کو ہے......کدھر ہے؟

موسم صاف ہونے کی صورت میں پل عبور کرنے کے بعد نظر آنے والے نانگا پربت کی جھلک البتہ کسی حد تک ذوقِ نظارہ کی تسکین کا ساماں کر سکتی ہے۔

تھاپیچی پل سے آگے تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک دریائے استور کے کنارے پہنچتی ہے اور کشادہ منظر نامہ ایک تنگ گھاٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔یہ استور گورج ہے۔اس مقام پر دریا کا بہاؤ کچھ ایسا ہے کہ قدیم زمانے میں اسے شیطانی نالا کہا جاتا تھا۔شیطانی نالے کے رام گھاٹ پل پر بلتستان کی جنگ آزادی کا اہم ترین باب لکھا گیا۔اس پل کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

رام گھاٹ پل کشمیر سے گلگت جانے کا عمومی راستہ اور مصروف تجارتی شاہراہ ہونے کے علاوہ اہم ترین دفاعی مقام بھی تھا۔گلگت سکاؤٹس نے جان پر کھیل کر رسّوں سے بنایا گیا پل کاٹا اور گلگت کے لیے مہاراجا کشمیر کی فوجی کمک کا راستہ بند کر دیا۔یہ دستے اگر گلگت پہنچ جاتے تو شاید گلگت بلتستان کی آزادی کا خواب تعبیر نہ پاتا۔یہ بھی کشمیر کی طرح بھارت کا اٹوٹ انگ کہلاتے۔

مجھے جگلوٹ میں بلتستان کی جنگ آزادی کے ایک سپاہی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

اُس کی بیان کردہ رام گھاٹ مہم ''سکردو میں یونم'' کے ایک باب میں شامل ہے۔

رام گھاٹ پر دریا کے اُس پار سری نگر سے آنے والی متروک سڑک آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ تاریخی شاہراہ کبھی برزل پاس سے ہوتی ہوئی گلگت بلتستان جاتی تھی۔اب یہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں رینگتی ہوئی بمشکل بونجی پہنچتی ہے اور اپنی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے حسرت سے پوچھتی ہے:

کہاں گئے سری نگر پر جھنڈا لہرانے کا دعویٰ کرنے والے؟

اسے کیا خبر کہ اپنے ملک پر جھنڈا لہرانے سے فرصت ملے گی تو کسی غیر پر نظر پڑے گی۔

موسم مہربان ہو تو رام گھاٹ سے تھوڑا سا آگے دور افق پر وادیِ نگر کی شہزادی ''راکاپوشی'' کا دیدار ہوتا ہے۔دنیا کی حسین ترین چوٹیوں میں شمار ہونے والی یہ برفانی دیوی میرے لیے محبوبِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس سے آشنائی چالیس برس پرانی ہے۔جب جب اس کے درشن کیے، یوں محسوس ہوا جیسے وہ بے وفائی کا شکوہ کرتے ہوئے اپنی بارگاہِ حسن میں حاضری کی دعوت دے رہی ہو۔

میں نے سلام محبت پیش کیا اور وعدہ کیا کہ پہلی فرصت میں درشن کو آؤں گا۔

راکاپوشی اپنے چاہنے والوں کے ہرجائی پن سے واقف ہے اور ہر بار شکوہ کرتی ہے:

وعدہ کر کے مکر گیا ہائے...... بلم ''ہئی مان'' نکلا

راکاپوشی کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی استور گورج اپنے اصل روپ میں سامنے آتی ہے۔

انتہائی تنگ وادی، اُس سے زیادہ تنگ سڑک، دونوں طرف سنگلاخ بلندیاں، لینڈ سلائیڈنگ کے خطرات اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریائے استور عرف شیطانی نالا

کسی زمانے میں روڈ تو استور اور چکور ہی چکور کا شور تھا۔ اب نہ چکور دکھائی دیتا ہے، نہ چکوری۔

چکر پھیریاں البتہ قدم قدم پر دل دہلائے رکھتی ہیں۔ شونٹھر ٹنل مکمل ہونے کے بعد یہی سڑک استور ایکسپریس وے بن جائے گی۔ کاش یہ خبر درست ہو...... کاش غلط ہو۔

استور کے بیش تر فطرت کدے بازاری تماش گاہ بن کر رہ جائیں گے۔

شاہراہِ قراقرم کے استور موڑ سے بیس کلومیٹر بعد، ڈوئیاں پولیس چیک پوسٹ پر وادیِ استور میں داخلے کا اندراج ضروری ہے۔ چیک پوسٹ کے قریب کتابی صورت کا رہنما بورڈ نصب کیا گیا ہے۔

کتاب کے اوراق پلٹتے جایئے اور وادیِ استور کے سیّاحتی مقامات...... راما جھیل، وادیِ روپل، دیوسائی، منی مرگ اور گوٹم سر عرف اللہ والی جھیل سے تعارف حاصل کرتے جایئے۔

سڑک کنارے سیّاحتی کتابچہ بنانے کا یہ منفرد انداز ہمیں بہت پسند آیا۔

چوبی کتابچے کے قریب کھڑے ہو کر کپتان صاحب نے آسمان کو جاتی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مشکن گاؤں (MUSHKIN) کے جنگلات سے گزرتی ہوئی، ڈشکن گاؤں کی خوب صورت بستی تک جاتی ہے اور ہرچو (HARCHU) کے قریب دوبارہ استور ویلی روڈ سے آملتی ہے۔

مشکن ایک تاریخی اور دلکش سیّاحتی مقام ہے۔ یہاں بدھ دور کے آثارِ قدیمہ آج بھی موجود ہیں۔

مشکن جانے کے لیے فور بائی فور جیپ درکار ہے۔

فطرت پسند وہاں ایک رات قیام کرنا لازم سمجھتے ہیں۔ ہم نے مشکن کے جنگل میں منگل منانا خواہشات کی فہرست میں شامل کر لیا۔ اس فہرست میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کمی کب ہوگی؟ رب جانے۔

ڈوئیاں سے تیرہ کلومیٹر آگے ہرچو گاؤں صحرا میں نخلستان کی مانند ابھرتا ہے۔ سڑک کنارے خوبانی اور اخروٹ کے درخت قابلِ دید منظر پیش کرتے ہیں۔ دریا پار ایک چٹانی کٹاؤ سے نمودار ہونے والے نالے کو فروغِ سیاحت کی خاطر ''ہرچو آبشار'' کا خطاب دیا گیا ہے۔

ہرچو سے پندرہ کلومیٹر آگے سڑک کے دونوں جانب پتھریلے ستون نظر آئے جن کی بلندی پر

مارخور کے مجسمے نصب ہیں۔ انھیں بابِ استور کہا جاتا ہے۔ اسے ''بابِ فطرت'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ یہاں سے آگے قدم قدم پر فطرت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔

بابِ استور کے بائیں جانب ایک نسبتاً تنگ راستہ استور شہر کو بائی پاس کرتا ہوا گوری کوٹ تک جاتا ہے۔ نانگا پربت بیس کیمپ یا منی مرگ کی سمت اپنی ٹرانسپورٹ پر آنے والے سیّاحوں کے لیے استور کی بجائے گوری کوٹ میں قیام مناسب رہتا ہے۔ ہم استور جانے پر مجبور تھے، یہ انتخاب نہیں کر سکتے تھے۔

جگلوٹ سے استور پہنچنے میں اڑھائی گھنٹے لگے۔

استور ایک طرح کی تھری اِن ون آبادی ہے۔ اسلام آباد سے آنے والے اسے گاؤں، گلگت یا سکردو سے آنے والے قصبہ اور وادیِ استور کے باشندے شہر سمجھتے ہیں۔

گلگت بلتستان انتظامی لحاظ سے تین ڈویژنز پر مشتمل ہے۔ گلگت، بلتستان اور دیامیر

دیامیر ڈویژن کے چار اضلاع میں سے ایک استور بھی ہے۔ شجرہ نسب کے مطابق استور بلتستان کے ضلع سکردو کا ''باپ جایا'' بھائی ہے۔ انتظامی سہولت کے لیے اسے دیامیر ڈویژن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس رشتے کی تفصیل کے لیے ''سکردو میں یونم'' کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''بلتستان کا اوّلین ذکر چین کے قدیم جنگ ناموں میں ملتا ہے۔ مارکو پولو نے اسے پولو یا پولا کے نام سے یاد کیا ہے، جو عربی میں بولور اور فارسی میں بلاورستان بنا۔ مغل مورخین اسے تبت خورد یا چھوٹا تبت کہتے ہیں۔ ڈوگرہ حکمران بلتستان کے مرکز سکردو کو صرف ''کردو'' کہتے تھے۔

چین اور تبت کے تاریخ دان اسے بلتی یُل کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو رفتہ رفتہ بلتستان بن گیا۔

بلتستان میں انتقالِ آبادی تیسری یا چوتھی صدی قبل مسیح میں تین سمتوں سے شروع ہوا۔

(۱) تبت سے براستہ گلگت اور دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ یعنی عالم پل تا سکردو روڈ پر سفر کر کے آنے والے لوگ، وادیِ سکردو کی مختلف ذیلی وادیوں مثلاً چُندہ، کچورا، سوق، شگری اور بیانا مقپو (کالا صحرا...... کولڈ ڈیزرٹ) میں آباد ہوئے۔

(۲) ہنزہ اور نگر سے آنے والے ہسپر لا (سنو لیک) اور اسکولی کے راستے وادیِ شگر پہنچے۔

(۳) لداخ سے زوجی لا کے راستے آنے والے خپلو (گنگ چھے) میں آباد ہوئے۔

بلتی یُل کی آبادی میں اضافے کے بعد طاقت کی جنگ ناگزیر ہوگئی۔ اس جنگ میں تبت سے آنے والے ''گیالپو سکر'' نے فتح حاصل کی اور بلتستان کی حکمرانی سنبھال کر شگری کو (آج کل سکردو کا قصبہ)

دارالحکومت قرار دیا۔تبت نژاد حکمرانی کے باعث بلتستان کو تبت خورد کہا جانے لگا۔

بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر گیالپو سکر کے خاندان کا چراغ صرف ایک خاتون شگری کی صورت میں روشن تھا۔ راجا کے بارہ وزیروں میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ مس شگری کی شادی اُس کے بیٹے سے ہو، تاکہ راج پاٹ اُس کے گھر کی لونڈی بن جائے۔ اُنھیں دنوں ایران کا شہزادہ ابراہیم (یا مصر کا دیوتا مقپون) وارد ہوا اور مس شگری کا دل جیت کر شگری کی حکومت پر قابض ہو گیا۔

گیالپو خاندان کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ مقپون دور کا آغاز ہوا۔

مس شگری اور مقپون دیوتا کے ملاپ نے چار بیٹوں کو جنم دیا۔ یہ جوان ہوئے تو مقپون نے انھیں اپنے چار مقبوضہ علاقوں کی حکمرانی سونپ دی اور خود سلطنت کے مرکز شگری تک محدود ہو گیا۔

یہ علاقے ،سکردو، استور، روندو اور کرتخشہ تھے۔

کرتخشہ آج کل کھرمنگ کہلاتا ہے، یعنی قلعوں کی سرزمین

آج کا پس ماندہ استور ماضی قریب میں ایک اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔

تبت اور سنکیانگ سے کشمیر جانے والے راستے اسی شہر سے گزرتے تھے۔ ابوریحان البیرونی اسے اسویر (ASWIR)، برطانوی سیاح گاڈفرے وائنے حُصارا (HUSARA) اور ایرانی مورخ حصورا (HASORA) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

استور پر مقپون خاندان کی خودمختاری کا خاتمہ کشمیر کے سکھ حکمرانوں کے دور میں ہوا۔

اس کا اختتامی باب مہاراجا گلاب سنگھ کے وزیر اور کماندار لکھپت کشتواریہ نے ۱۸۴۷ء میں لکھا اور استور کے راجا جبار خان مقپون کو شکست دے کر استور پر قبضہ کر لیا۔ جبار خان نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے مقپون سلطنت کا نام بچا لیا۔ گلگت سکاؤٹ اور چلاس سکاؤٹ کی جنگ آزادی نے ۱۹۴۸ء میں برائے نام مقپون سلطنت کا خاتمہ کر کے، استور اور سکردو کو گلگت ایجنسی کا حصہ بنا دیا۔

گلگت ایجنسی نے اسی سال پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔

ایک سو بیس کلومیٹر طویل وادی استور کا رقبہ تقریباً پانچ ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔

وادی کا مرکز استور ایک ایسی انگوٹھی کی مانند ہے جس کے نگینے چاروں طرف بکھیر دیے گئے ہوں۔

پاکستان میں شاید ہی کوئی دوسرا شہر ہو جس کے اطراف پچاس کلومیٹر کے دائرے میں فطرت نے اتنی رنگینیاں نچھاور کی ہوں جتنی استور کے اردگرد بکھیر رکھی ہیں۔

راما جھیل، چونگڑہ پیک، ترشنگ گاؤں، وادیِ روپل، نانگا پربت، ہرلی کوفر بیس کیمپ، ٹاپ میڈوز، لاتوبو میڈوز اور بیس کیمپ، مازینو بیس کیمپ، پری شنگ ویلی، گوئم سر ویلی عرف اللہ والی جھیل......اور تھوڑا سا آگے چلیے تو چلم چوکی، دیوسائی، برزل پاس، منی مرگ، دومیل، رین بو جھیل، کامری پاس......درلے جھیل، رٹو گاؤں، شونٹھر پاس......اور کالا پانی ویلی

کہاں تک سنو گے......کہاں تک سناؤں......ہزاروں ہی جلوے ہیں......کیا کیا دکھاؤں

استور شہر خود بھی بے رنگ نہیں ہے۔ استور بازار کے اختتام پر ''دیشلی تو'' پاور ہاؤس سے آنے والا نالا ایک آبشار کی صورت میں نیچے گرتا ہے اور چھوٹی سی جھیل بناتا ہے۔

گویا شہر کے دل میں فطرت نے اپنے رنگین جلووں کا دریا بہا دیا ہو۔

رنگین جلووں کے دریا پر بنایا گیا پل استور کی شام کو ''شامِ اودھ'' بنا دیتا ہے۔

چند عشرے پہلے تک قیام و طعام کے حوالے سے استور میں مناسب سہولیات میسر نہیں تھیں۔ اب کئی اچھے رہائشی ہوٹل تعمیر ہو چکے ہیں۔ کھانے کا مسئلہ البتہ برقرار ہے، مگر مقامی لوگوں کی مدد سے قابلِ قبول ریستوران تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے کرم فرما جناب عبدالبصیر تاجور نے اپنے دوست عاقل استوری کی وساطت سے ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب مدینہ گرین ہوٹل میں کمرا مخصوص کروا دیا تھا۔ انھوں نے عنایت نہ کی ہوتی تو سارا دن ہوٹل گردی میں گزر جاتا۔ ڈرائیور نے ہوٹل کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی۔

ہم نے کپتان صاحب کو الوداع کہا اور کمرے میں جا پہنچے۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے اور دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ہوٹل کی برق رفتار سروس نے ایک بجے کھانا پیش کر دیا۔

آج کا باقی دن آرام کے لیے وقف تھا۔ سورج غروب ہونے میں تقریباً چھ گھنٹے باقی تھے۔

ہمیں ایک سدا بہار اور آزمودہ محاورہ یاد آیا تو نیت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔

جو سوتے ہیں وہ ''کھوتے'' ہیں۔

کیوں نہ دن میں آرام کرنے اور سونے کا پروگرام راما جھیل کے دیدار پر قربان کر دیا جائے؟

ہم چائے کا انتظار کرتے ہوئے اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک دبلے پتلے بزرگ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے اور کاؤنٹر کلرک سے گفتگو کرنے لگے۔ اُس نے ہماری طرف اشارہ کر دیا۔

بزرگ نے ہمیں سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا:

''بصیر نے ہمیں آپ لوگوں کے بارے میں فون کیا تھا؟''

''بصیر؟ کون بصیر؟'' میں نے اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے حیران لہجے میں سوال کیا۔

''اوہ۔ آپ بصیر والے مہمان نہیں ہیں۔ اُس نے ہمیں فون کیا تھا کہ پنجاب سے مہمان آ رہے ہیں۔ اُن کے لیے کسی مناسب ہوٹل میں کمرے بک کروا دیں۔ ہم نے اِدھر کمرہ بک کروا دیا تھا۔ آج ہوٹل میں کوئی اور مہمان بھی نہیں آیا۔ یہ بصیر کا مہمان آخر کدھر نکل گیا۔''

اُن کی خود کلامی سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔

''آپ عبدالبصیر تاجور صاحب کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے شرمندہ لہجے میں تصدیق چاہی۔

''ہاں ناں۔ ہم عاقل استوری ہیں۔ اس کا مطلب ہے بصیر کے مہمان آپ ہی ہیں؟''

ہم نے بصیر کا مہمان ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد دل ہی دل میں تبصرہ کیا کہ جو شخص عبدالبصیر تاجور صاحب کو صرف بصیر کہتا ہے وہ استوری بے شک ہو، عاقل کسی صورت نہیں ہو سکتا۔

ہمیں عبدالبصیر تاجور صاحب سے روبرو ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہے۔ فیس بک پر اُن کی تصاویر نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ وہ عمر میں ہم سے بہت چھوٹے نظر آتے ہیں، مگر علم و ادب اور زبان و بیان کے حوالے سے بہت بڑی شخصیت ہیں۔ اُردو الفاظ کی اِملا پر اُن سے اصلاح لینا معمول بن چکا ہے۔ اُنھیں عربی، فارسی اور انگریزی پر بھی یکساں عبور حاصل ہے۔

ہم اُنھیں ادب و احترام کے ساتھ مخاطب کرنے کے عادی ہیں، صرف بصیر کچھ اجنبی سا لگا اور زبان سے بے ساختہ ''کون بصیر؟'' پھسل گیا۔ عاقل استوری صاحب سے چند منٹ کی گفتگو کے بعد علم ہوا کہ وہ عبدالبصیر تاجور صاحب کے لنگوٹیا دوست اور ہم جماعت ہیں۔ عبدل اور تاجور کے چکر میں نہیں پڑتے، اگر کسی مجبوری کی وجہ سے بصیر کے ساتھ کوئی خطاب لگانا پڑ ہی جائے تو......

اللہ معافی...... سننے سنانے کے قابل نہیں ہے۔

عبدالبصیر تاجور اور عاقل استوری کے ہم جماعت، یعنی ہم عمر ہونے کا انکشاف حیران کن تھا۔ عاقل استوری صاحب کی وضع قطع اور انگ انگ سے چھلکتی ہوئی بزرگی دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ عبدالبصیر تاجور صاحب کے ہم جماعت ہیں۔ وہ تو ان کے اُستادوں کے اُستاد معلوم ہوتے تھے۔

اُنھیں دیکھ کر دلی اطمینان ہوا کہ ہم عبدالبصیر تاجور صاحب کو عزت و احترام کے ساتھ مخاطب کر کے نہ صرف ادب کے تقاضے پورے کرتے ہیں، بلکہ عمر کے تقاضے بھی نبھاتے ہیں۔

عبدالبصیر صاحب سے معذرت کہ عاقل استوری صاحب کی ملاقات سے پہلے ہم اُنھیں جوان سمجھتے تھے۔ اب ''قریباً قریباً'' اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ انیس بیس کا فرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُنھیں ''بیس'' سمجھنا عاقل صاحب سے ملاقات کا نتیجہ ہے۔ ہم غیر عاقل اس باب میں بالکل بے قصور ہیں۔

پنجاب سے آئے ہوئے مہمان دریافت کرنے کے بعد عاقل استوری صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دیر مشکوک انداز میں ہمارے اور ''بصیر'' کے رشتے کی پرتیں کھولتے رہے۔

پوری طرح تسلی کرنے کے بعد استور میں ہماری مصروفیات کے بارے میں سوال کیا۔

ہم نے بتایا کہ چائے کے بعد کسی ٹیکسی والے کی تلاش میں نکلیں گے جو ہمیں راما جھیل کے درشن کروا لائے۔ وہاں سے واپس آ کر روپل فیس بیس کیمپ ٹریک کے انتظامات کریں گے تاکہ کل صبح وادیِ روپل کے لیے سفر شروع کیا جا سکے۔ عاقل صاحب نے فرمایا:

''آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ مناسب سمجھیں تو ٹیکسی کی تلاش کا کام ہم پر چھوڑ کر اطمینان سے چائے کا لطف اٹھائیں۔ ٹیکسی آ جائے تو راما جھیل کا چکر لگا آئیں۔ ہم اس دوران ٹریک سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ جھیل سے واپس آئیں گے تو حاصل شدہ معلومات سے آگاہ کر دیا جائے گا۔''

اس عنایت پر ''چپڑی اور دو دو'' کا محاورہ یاد آ گیا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ ٹیکسی تلاش کرنے سے پہلے چائے کا جام نوش فرماتے جائیں۔ اُنھوں نے مہمانوں کا مہمان بننے سے معذرت کی اور رُخصت ہوتے ہوئے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی آسانیاں پیدا فرمائے۔

ہم کافی دیر تک چائے کا انتظار کرتے رہے۔ ہوٹل کی برق رفتار سروس نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ قاسمی صاحب صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے کچن میں تشریف لے گئے تو انکشاف ہوا کہ چائے کا آرڈر خود اُن کے مغل شاہی احکامات کی نذر ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے ہدایت کی تھی کہ چائے کے لیے تازہ دودھ استعمال کیا جائے، ڈبّے کا دودھ نہیں چلے گا۔ استور شہر میں یہ نعمت تقریباً نایاب ہے۔ اس لیے چائے کی پتی تازہ دودھ کے انتظار میں سوکھ رہی تھی۔ قاسمی صاحب نے وضاحت کی کہ تازہ دودھ کوئی شرط نہیں، بس ایک چھوٹی سی فرمائش تھی۔ چائے کی تیاری دوبارہ شروع کر دی گئی۔

پہاڑوں میں سکون اور وقار سے بنی ہوئی چائے ہی اچھی لگتی ہے۔

اِدھر بیرا چائے لایا...... اُدھر عاقل استوری صاحب ایک ٹیکسی ڈرائیور لے آئے۔

جب جا ہو چلے آ ؤ یہاں دید کی خاطر

بکری مدھانی......بابا جی انکل......مُنّی جھیل......راما جھیل......چونگڑہ پیک

عاقل استوری صاحب نے بتایا کہ نصرت دین اُن کا پڑوسی ہے۔ ہمیں سیّاح کی بجائے مہمان سمجھتے ہوئے صرف دو ہزار کرائے پر راضی ہو گیا ہے۔ مارکیٹ میں راما لیک کے لیے ٹیکسی کا کرایہ تین سے چار ہزار چل رہا ہے۔ نصرت دین نے وضاحت کی کہ اُس کی کار جھیل تک نہیں جا سکے گی۔

راما جھیل کا سفر دراصل تین مرحلوں میں طے ہوتا ہے۔

استور سے دس کلومیٹر دور راما میڈوز تک کار جا سکتی ہے۔

وہاں سے گھوڑا اسٹاپ تک اڑھائی کلومیٹر سفر کے لیے جیپ درکار ہوگی۔

گھوڑا اسٹاپ سے جھیل تک ڈیڑھ کلومیٹر پیدل ٹریک ہے۔ البتہ گھوڑا یا موٹر سائیکل مل سکتا ہے۔

مجاہد قاسمی صاحب نے یہ تفصیل سننے کے بعد نصرت دین کو مخاطب کر کے دلچسپ تبصرہ فرمایا:

''گویا جھیل تک پہنچنے کے لیے پہلے آپ کی کار، پھر جیپ، پھر گھوڑا اور آخر میں دعا درکار ہے۔''

نصرت دین کے ساتھ عاقل استوری صاحب نے بھی فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

راما جھیل سفر کے پیچیدہ مرحلے قہقہے میں نہیں اُڑائے جا سکتے تھے۔ ہم تذبذب کا شکار ہو گئے۔

نصرت دین نے یقین دلایا کہ سب مرحلے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں نمٹ جائیں گے اور ہمیں غروبِ آفتاب سے پہلے جھیل کی تصویریں بنانے کے لیے تین گھنٹے مل جائیں گے۔

مجاہد قاسمی صاحب نے تفصیل سن کر فرمایا کہ راما جھیل کی فوٹوگرافی کے لیے صبح کا وقت مناسب رہتا ہے۔ شام کے وقت پہاڑوں کے سائے جھیل پر پڑنے لگتے ہیں تو تصویر اچھی نہیں آتی۔

میں نے توجہ دلائی کہ فی الحال ہم فارغ وقت کا فائدہ اٹھا کر راما جھیل ''بھگتانے'' کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُس کا منظرنامہ فوٹوگرافی کے لیے خصوصی حاضری کا طلب گار ہوا تو ٹریک کے بعد دوبارہ پروگرام بنا لیا جائے گا۔ قاسمی صاحب خاموش ہو گئے۔ مگر اُن کا انداز بتا رہا تھا کہ خاموشی جبری ہے۔

خاموش رضامندی کا اظہار ہو جائے تو جبر نہ کرنا سستی اور کمزوری کی نشانی ہے۔

راما جھیل کی طرف ''جبری'' سفر شروع ہوا۔ راما روڈ بتدریج چڑھائی چڑھتے ہوئے دس کلومیٹر

سفر کے دوران ۷۰۰ میٹر بلندی حاصل کرتی ہے۔ استور سے نکلتے ہی سڑک کی خستہ حالی ''ریشلی تو'' نالے کی قربت میں سفر کرتے ہوئے مسافر کے ساتھ ساتھ گاڑی کے کل پرزوں کی بھی چیخیں نکلوا دیتی ہے۔

چونگڑہ گاؤں کی خوب صورت آبادی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی بدمزاجی مسافر کے مزاج ٹھکانے لگانے میں لگی رہتی ہے اور منظر کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہیں دیتی۔

موڑ پہ موڑ مڑنے والی یہ سڑک تقریباً پانچ کلومیٹر بعد اپنا رنگ بدلتی ہے اور ایک دلکش منظرنامے میں داخل ہو کر سیدھی ہو جاتی ہے۔ دائیں جانب سنگلاخ بلندی جوں کی توں رہتی ہے۔ بائیں جانب بہت نیچے نظر آنے والی وادی کی سرسبزی اور شادابی میں قدم بہ قدم اضافہ ہونے لگتا ہے۔

یہ منظر وادیِ راما کا پیش منظر ہے۔

اس کا پس منظر دور افق پر برف پوش چوٹیوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

راستے سے کچھ دور دائیں جانب پی ڈبلیو ڈی (PWD) کے ریسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت نظر آتی ہے جو راما میڈوز کی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ اس سے آگے بائیں جانب پی ٹی ڈی سی (PTDC) موٹیل کبھی اپنے روایتی طرزِ تعمیر اور کھلے بازوؤں کے ساتھ استقبال کرتا تھا۔ آج کل اس کے بند دروازے آنے جانے والوں کو حسرت بھری نظروں تکتے ہوئے اپنی بربادی کا نوحہ سناتے ہیں۔

پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے زیرِ انتظام قیام و طعام کی سہولت فراہم کرنے والے یہ موٹیل ملک میں سیّاحت کی تاریخ کا ایک درخشاں باب تھے۔

کلر کہار موٹیل کی فش فرائی، سکردو موٹیل کا ناشتا اور سوپ، بشام موٹیل میں دریائے سندھ کے کنارے ڈنر اور کالام موٹیل کی مکھن ہانڈی شمال کے سفر کا لذیذ ترین تحفہ سمجھے جاتے تھے۔

راما موٹیل بھی ایک چٹخارے دار روایت تھی۔ راما جھیل کے درشن کو آنے والے یہاں چائے یا کافی کا کپ نوش فرماتے تھے اور عموماً دوپہر یا رات کے کھانے کا آرڈر لکھوا کر آگے جاتے تھے۔

یہ موٹیل معیاری قیام و طعام کے ساتھ، خصوصاً کھانا پیش کرنے کے انداز میں، انگریز دور کی چند روایات کے امین تھے۔ ملکی سیّاح بھلے ہی ''کشکاوشکا'' سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہوں، مگر غیر ملکی نہ صرف انھیں سراہتے، بلکہ پاکستان کی سیّاحت کا اکلوتا قابلِ تعریف پہلو قرار دیتے تھے۔

مارچ ۲۰۱۹ء میں سیّاحت کا سیزن شروع ہوتے ہی، خسارے کا الزام لگا کر اِن موٹیلز کی چھ شاخیں بند کر دی گئیں۔ ۲۰۲۰ء میں خسارے کے ساتھ کرونا کو نتھی کر کے باقی سب عمارتوں پر بھی

تالے ڈال دیے گئے......ڈالنے والوں کی عقل پر پہلے ہی پڑ چکے ہوں گے۔

سیّاحتی تنظیموں، ٹور آپریٹروں اور الپائن کلب کی انتظامیہ نے شدید احتجاج کرتے ہوئے اس احمقانہ فیصلے کو وطن عزیز کی سیّاحت کے لیے خودکُش بم دھماکا قرار دیا۔

مگر حکومت کے کان ہی نہیں تھے، جوں کہاں رینگتی؟

اگر خسارے کی بنیاد پر ادارے بند کرنے کا اصول طے پا گیا ہے تو سب سے پہلے پارلیمنٹ، عدلیہ اور بیوروکریسی کے دفاتر پر تالے لگنے چاہئیں۔ اُن کے بعد پی آئی اے، ریلوے، پوسٹ آفس اور واپڈا جیسے سفید ہاتھیوں کی باری آنا چاہیے جو برسوں سے ملک کو اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں۔

پاکستان کی لولی لنگڑی سیّاحت کے لیے یہ فیصلہ ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کے مترادف تھا۔

اب (۲۰۲۵ء میں) خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ سکردو اور ناران کے علاوہ چند اور موٹیل بھی ریٹائرڈ جرنیلوں کی پرائیویٹ کمپنی گرین ٹورازم کو لیز پر دے دیے گئے ہیں۔ آیئے فاتحہ پڑھ لیں۔

راما پی ٹی ڈی سی موٹیل کی بند عمارت دیکھ کر نہ جانے کیوں جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔

بھڑاس نکل گئی۔ فائدے کی توقع رکھنا محض حماقت ہے۔ ایس لئی مٹی پاؤ۔ تے اَگّے چلّو

استور سے روانہ ہونے کے آدھ گھنٹے بعد ہم ایک خوب صورت سبزہ زار میں داخل ہوئے۔

نصرت دین کے مطابق یہ راما میڈوز کی شروعات تھیں۔ آج کل فطرت کی طرف سے خوش آمدید کہنے کا فرض، راما پولو گراؤنڈ اور سرسبز و شاداب میدان میں بہنے والے جھلمل پانی ادا کرتے ہیں۔

اِن پانیوں میں ہلکورے لینے والی لہریں زائرین کے دل میں امید کا دیا روشن کرتی ہیں۔

راما کی ابتدا تو بہت با کمال ہے
اب انتہا پہ دیکھیے کیا کیا جمال ہو

راما میڈوز دراصل ایک سے زیادہ چھوٹے چھوٹے سبزہ زاروں کا مجموعہ ہے۔

یہ مجموعہ اس نام کی وجہ بھی ہے اور گرامر کی غلطی بھی۔

بنات گل آفریدی اپنی کتاب ''بلتستان ان ہسٹری'' میں لکھتے ہیں کہ بلتی زبان کے لفظ ''راما'' کی ''میم'' کا درست تلفظ بلتی زبان بولنے والے ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اردو یا انگریزی میں اس لفظ کا درست املا لکھنا ممکن نہیں۔ اس ''میم'' کا بلتی تلفظ م۔ن۔گ۔ڑ۔ کا ملغوبہ ہے۔ اس لیے راما کو......رانا...... رانڑا......اور رانگا بھی لکھا اور بولا جا سکتا ہے۔ سکردو کا صحرا ''سرفارانگا'' اس دشواری کی عمدہ مثال ہے۔

بلتی راما کے معنی چراگاہ، میدان، یا سبزہ زار ہیں جسے انگریزی میں میڈوز کہہ سکتے ہیں۔

راما ویلی یا وادیِ راما گرامر کے لحاظ سے درست ہے۔ یعنی چراگاہوں کی وادی

راما جھیل بھی ٹھیک ہے، یعنی چراگاہوں کی جھیل۔ مگر راما میڈوز کے معنی کیا ہوں گے؟

چراگاہ چراگاہ؟......میڈوز میڈوز؟......راما نہ ہوا بچوں کا کھیل ہو گیا

چھوڑیں جی۔ اتنی باریکیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم راما جھیل کی قربت میں بلتستان کی زبان سیکھنے نہیں فطرت کی بولی سمجھنے آئے ہیں۔ راما میڈوز گرامر کے لحاظ سے غلط ہو گا، اپنی رعنائی، شادابی اور دل بری کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔ راما کے معنی ڈکشنری کے ورق پلٹنے سے سمجھ نہیں آتے، جھیل کے راستے میں آنے والے سبزہ زاروں کا منظر دیکھ کر ذہن نشین ہوتے ہیں۔

تلفظ کے بارے میں اتنی لمبی چوڑی بحث بظاہر غیر ضروری ہے مگر ''راما'' نے ایک غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ بھارت میں سناتن دھرم کے ماننے والے راما کو اپنے بھگوان رام سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں وادیِ استور سناتن دھرم کا مرکز تھی۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی شدّت پسند حکومت وادیِ استور سے سناتن دھرم کے تمام آثار مٹانے کے لیے پورا زور لگانے کے باوجود ''رام'' کا نام مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ اس ناکامی کو اپنے مہادیوتا رام کا معجزہ سمجھتے ہیں۔

سمجھتے رہیں، ہمیں کیا؟......ہماری راما بلتی دوشیزہ ہے......رام کی داسی نہیں!

ہم جلد از جلد جھیل تک پہنچنا چاہتے تھے، اس لیے جگہ جگہ رُک کر فطرت پاروں کی تصویر کشی واپسی کے سفر تک ملتوی کر دی اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ''راما گجب ڈھایو تیری نگریا'' گنگناتے ہوئے راما کیمپ سائٹ پر پہنچ گئے۔

اس رنگا رنگ کیمپ سائٹ کا پیش منظر، منظر اور پس منظر سب کچھ لا جواب ہے۔ اس جگہ کرائے کے خیمے دستیاب ہیں۔ اپنا خیمہ بھی نصب کیا جا سکتا ہے۔ ہوٹل اور قیام و طعام کے بورڈ بھی لگے ہوئے ہیں۔ وقت میسّر ہو تو اس جگہ شب باشی کر کے اگلے روز صبح تڑکے راما جھیل کے لیے نکلنا چاہیے۔

قاسمی صاحب کے بقول راما جھیل کے درشن کا لطف سورج طلوع ہوتے وقت ہی آتا ہے۔

نصرت دین نے مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی اور ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دور کھڑی ہوئی جیپوں کی طرف چل دیا۔ ایک ڈرائیور سے چند سیکنڈ گفتگو کرنے کے بعد اُس نے خوش خبری سنائی کہ یہ جیپ والا صرف پچیس سو روپے کرایہ مانگ رہا ہے۔ آج سیّاحوں کی تعداد

بہت زیادہ ہے اس لیے دوسرے ڈرائیور پینتیس سو سے کم میں نہیں جا رہے۔

''ڈاکٹر جی، یہ ہمارے لیے پورے ایک ہزار کی رعایت کیوں کر رہا ہے؟ ایہہ ساڈے مامے دا پتر لگدا اے؟'' قاسمی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

قاسمی صاحب بلا کے ''مزاح دان'' ہیں، مگر مزاح میں بھی رکھ رکھاؤ اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اردو میں شگوفے چھوڑنے کے ماہر ہیں، مگر پنجابی جگت اُن کے مزاج سے کوسوں دور ہے۔ اس لیے مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ''مامے دا پتر'' اُن کی زبان پر کیسے چڑھ گیا۔

''اُستاد جی، یہ آپ بول رہے ہیں؟'' میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''اور کیا بولیں جی۔ ایک گھنٹے تک شینا زبان کے گانے سنتے سنتے دماغ پک گیا ہے۔ بھول گیا سب کچھ، یاد نہیں اب کچھ۔ صرف مامے دا پتر یاد رہ گیا ہے۔'' اُنھوں نے بے نیازی سے کہا۔

نصرت دین سارے راستے کان پھاڑ آواز میں شینا زبان کے گانے سنتا اور ہمیں سنواتا آیا تھا۔ میں ایسے گانے سنتے ہوئے تصور کر لیتا ہوں کہ کان بند ہیں۔ قاسمی صاحب ہر قسم کی موسیقی نہ صرف سنتے ہیں، بلکہ اس میں سر اور تال بھی کھوجتے رہتے ہیں۔ نہ ملیں تو جلنا کڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

دماغ بچارا پکتا نہ تو کیا کرتا؟...... چل جاتا؟

''سر جی دماغ ذرا ٹھنڈا کریں اور بے تکی فقرے بازی چھوڑ کر جیپ ڈرائیور کے ساتھ کرائے کے معاملات طے کر لیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' میں نے توجہ دلائی۔

جیپ والے سے کرائے کے معاملات طے کرنا کیوں ضروری ہیں؟'' اُنھوں نے سوال کیا۔

''جی؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔ راما جھیل نہیں جانا؟'' میں نے حیران ہو کر جوابی سوال کیا۔

''تو چل پڑیں ناں ڈاکٹر جی! دیر کیوں کر رہے ہیں۔ راما جھیل تک پیدل ٹریک کرتے ہیں۔''

مجھے شک ہوا کہ قاسمی صاحب کا دماغ پکتے پکتے خراب ہو گیا ہے۔ ہم نے استور میں پروگرام بنایا تھا کہ راما میڈوز تک کار پر اور گھوڑا اسٹاپ تک جیپ میں سفر کریں گے۔ گھوڑا اسٹاپ سے آگے کا فیصلہ صورتِ حال کے مطابق خود بخود ہو جائے گا۔ اب قاسمی صاحب ایک ناقابل یقین تجویز دے رہے تھے۔ جیپ کی سہولت میسّر ہوتے ہوئے پیدل ٹریک کرنے کی کیا تک تھی؟

اُن کی تجویز سن کر پاس کھڑے ہوئے جیپ ڈرائیور نے خبردار کیا:

''پیدل کا راستہ بہت مشکل ہے سر۔ اُدھر سب لوگ جیپ پر جاتا ہے۔''

''آپ پچیس سو روپے کی خطیر رقم بچانا چاہتے ہیں؟'' میں نے قاسمی صاحب سے سوال کیا۔

''طنز نہ کریں ڈاکٹر جی۔ اللہ کا شکر کریں کہ پچیس سو روپے آپ کے لیے خطیر رقم نہیں ہے۔ میں نے راولپنڈی ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ نے تفریحی سفر کو ٹریک میں تبدیل ضرور کر لیا ہے لیکن کامیابی کا یقین نہیں رکھتے۔ آپ نے کہا تھا کہ لاتوبو پہنچ گئے تو اللہ کا شکر ادا کریں گے، ورنہ جہاں تک پہنچ سکے، پڑاؤ کر کے واپس آ جائیں گے۔ لاتوبو بیس کیمپ کے راستے میں بازن گلیشیر کی تقریباً ایک کلومیٹر چوڑائی عبور کرنا پڑے گی۔ دو تین جگہ ٹھیک ٹھاک چڑھائی بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جھیل تک پیدل ٹریک کر کے اپنا اپنا امتحان لے لیتے ہیں۔ اگر جھیل ہی تک نہ پہنچ سکے تو لاتوبو کیسے پہنچیں گے؟ اس صورت میں مناسب ہو گا کہ لاتوبو کی بجائے ہرلی کوفر بیس کیمپ پر نانگا پربت کی تصویریں بنا کر واپس آ جائیں۔ جھیل تک جانے اور آنے کا ٹریک آسانی سے مکمل ہو گیا تو بے یقینی کی کیفیت کم ہو جائے گی اور ٹریک زیادہ اعتماد کے ساتھ شروع ہو گا۔''

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ''اپنا اپنا امتحان'' محض تکلّف ہے۔

وہ سو فیصد فٹ تھے۔ انھیں کسی امتحان کی چنداں ضرورت نہ تھی...... مجھے بہت زیادہ تھی۔

قاسمی صاحب کی لمبی چوڑی تقریر بتا رہی تھی کہ اُن کا دماغ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ راما جھیل تک پیدل ٹریک کو میری حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔

میرے کانوں میں کنکارڈیا ٹریک کے رہنما صادق علی کا قائدانہ اعلامیہ گونجنے لگا۔

''جو آج ٹھیک ٹائم پہ اردوکس پہنچتا ہے وہ کنکارڈیا بھی پہنچتا ہے۔ جو شام تک اردوکس نہیں پہنچتا، کنکارڈیا کیسے پہنچتا ہے؟ وہ چپ کر کے واپس جاتا ہے، خواہ مخواہ دوسروں کو خراب نہیں کرتا۔''

ٹھیک ہے سر۔ میں آپ کو خواہ مخواہ خراب نہیں کروں گا۔ جھیل تک پیدل جا کر امتحان میں پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے اُن کی تجویز قبول کرتے ہوئے کہا۔

''خراب؟ خراب کرنے کی بات کس نے کی ہے ڈاکٹر جی۔ ہم آپ کے ساتھ خراب ہی نہیں خجل خراب ہونے کے لیے بھی تیار ہیں۔ میری بات کو غلط رنگ نہ دیں۔''

''سر جی آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ راما جھیل تک پیدل ٹریک کی کوشش کرتے ہیں۔''

''راما جھیل تک پیدل ٹریک آسان نہیں ہے بزرگو۔ راستہ بہت خراب ہے اور ٹھیک ٹھاک چڑھائی ہے۔ دو تین گلیشیر بھی کراس کرنا پڑتے ہیں۔ اِدھر تو جوان جوان لوگ بھی جیپ اور گھوڑا لیتا

ہے۔ جونہیں لیتا، اُن میں کا آدھا لوگ راستے سے واپس آجاتا ہے۔ آپ جیسا بزرگ لوگ پیدل کیسے جائے گا؟ بیچ میں رہ گیا تو اُدھر جیپ بھی نہیں ملے گا۔'' جیپ ڈرائیور نے ڈرانے کی کوشش کی۔

''بہت اچھے۔ ٹھیک ٹھاک چڑھائی ہے اور گلیشیر بھی۔ آپ کے خیال میں ہم لوگ کتنی دیر میں جھیل تک پہنچ جائیں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہمیں ایک گھنٹا بھی نہیں لگتا، مگر آپ بزرگ لوگ ہو۔ تین چار گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔''

''ایک مرتبہ پھر بہت اچھے۔ تین چار گھنٹے جانا اور واپس آنا۔ یعنی بیس کیمپ ٹریک کی آدھی سٹیج۔ اور گلیشیر عبور کرنے کا تجربہ الگ۔ نصرت دین صاحب آپ بتائیں۔ ہم اگر پیدل جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ چلیں گے، یا اسی جگہ واپسی کا انتظار کریں گے۔''

''سر ہم نے عاقل صاحب کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ جھیل تک آپ کے ساتھ جائیں گے۔ اب اگر نہیں جاتے تو عاقل صاحب کو کیا جواب دیں گے؟ ہمیں تو ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''آپ کے ساتھ عاقل صاحب کا بھی شکریہ۔ اب چلنے کی تیاری کریں۔''

''سر ہم پھر بولتا ہے کہ آپ جیسے بزرگ لوگوں کا جھیل تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ہم چاہتا ہے کہ آپ جھیل دیکھنے آیا ہے تو دیکھ کر ہی جائے۔ جیپ کا راستہ ختم ہوتا ہے تو کچھ لوگ گھوڑا نہیں لیتا، پیدل جاتا ہے۔ اُدھر سے آپ بھی جا سکتا ہے۔ ایسا کرو، آپ دو ہزار دے دو۔ اب اس سے کم اور کیا کرے؟ اتنے کا تو ہمارا تیل لگ جائے گا۔''

جیپ ڈرائیور اتنی شدّ و مد سے بزرگی کا احساس نہ دلاتا تو مجھے علم ہی نہ ہو پاتا کہ میری بزرگی راما دیوی کے چرنوں میں قدم رنجا ہونے کے قابل نہیں رہی۔

میں نے زبردستی تھوپی گئی بزرگی کا لیبل اتارنے کے لیے راما جھیل تک قدم آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

جیپ ڈرائیور اور نصرت دین یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ ہم کرایہ کم کروانے کے لیے ''پھڑیں'' مار رہے ہیں اور جھیل تک پیدل جانے کی دھمکی کھوکھلی ہے۔ ہم نے اپنے اپنے کیمرا بیگ سنبھالے اور کیمپ سائٹ کے پہلو میں جھلملانے والی ندی کے پار جا پہنچے۔ تب نصرت دین کو یقین آیا کہ ہم واقعی سنجیدہ ہیں۔ اس نے جیپ ڈرائیور سے ہاتھ ملایا، ہلکا سا مسکرایا اور ہمارے ساتھ چلنے لگا۔

راما جھیل سے آنے والے صاف و شفاف پانیوں کے اُس پار ایک چھوٹا سا سبزہ زار تھا جس میں روایتی ''شیفرڈ ہٹس'' بکھرے ہوئے تھے۔ ہٹس کے سامنے تین چار بچے کھیل رہے تھے،

پندرہ بیس مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں اور چند بھیڑ بکریاں نرم نرم گھاس کی پتیاں چبا رہی تھیں۔

پتھر کے زمانے کی نمائندہ یہ ننھی سی بکروال بستی پیدل ٹریک کا خصوصی تحفہ تھی۔

یہ پسماندہ بستیاں ہی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرتی ہیں اور اس کے انمول خزانوں میں شامل ہیں۔ پگڈنڈی بستی کے بیچ سے گزر رہی تھی، جبکہ جیپ روڈ قدرے ہٹ کر بنائی گئی تھی۔

ہم اگر جیپ میں سفر کرتے تو بیتے زمانوں میں جھانکنے سے محروم رہ جاتے۔

مجاہد قاسمی صاحب ماضی کا قصہ بن جانے والے نوادرات کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ایک پتھریلے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے اُن کی نظر ''بکری مدھانی'' پر پڑی۔

دودھ بلونے یا رڑھکنے کا یہ آلہ بکری کی کھال سے بنی ہوئی مشک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی موٹی تازی بکری کو گردن اتار کر دیوار سے لٹکا دیا گیا ہو۔ قاسمی صاحب نے بکری مدھانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بکری کا دودھ اگر بکری کی (بکرے کی نہیں) کھال سے بنی ہوئی مشک میں جما کر لسی بنائی جائے تو مکھن کے ریزوں سے بھرپور لسّی جنت سے اُتارے گئے من وسلویٰ کا مزہ دیتی ہے۔ گوروں کے ''اَپ اور کولے'' اُس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے نوادرات کو دیکھتے ہی کیمرے میں محفوظ کر لینا چاہیے۔ چند عشرے بعد یہ بکروال بستی کی دیواروں پر نہیں، عجائب گھر کی دیواروں پر ملیں گے...... جیسے سوکھے ہوئے پھول مزاروں پہ ملیں۔

بکری مدھانی کو کیمرے میں محفوظ کرنے کے بعد میں نے نصرت دین سے فرمائش کی کہ بستی کے کسی گھر سے لسّی کا جگ خرید لائے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ من وسلویٰ کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔

نصرت دین نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔

اِس بے موقع ہنسی کی وضاحت طلب کرنے پر اُس نے بتایا کہ اس علاقے میں لسّی تو دور کی بات ہے، دودھ بیچنا بھی بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مال مویشی کی بہتات کے باوجود استور کے ہوٹلوں میں تازہ دودھ کی چائے نہیں ملتی۔

اُس نے ہمیں توجہ دلائی کہ سورج ڈھلنا شروع ہو گیا ہے اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس وقت جنت کے مشروب کا مزہ لینے سے بہتر ہے کہ جنتِ ارضی کے مزے لوٹنے کے لیے راما جھیل کا سفر جاری رکھا جائے۔ لسّی کے جگ واپسی پر چڑھا لیے جائیں گے۔ اس کا بروقت مشورہ قبول کر لیا گیا۔

بستی کے سبزہ زار سے گزرتے ہی کوہستانی منظر کی بھرپور عکاسی کرنے والا بے تحاشا پتھریلا

میدان سامنے آیا......ہم چند لمحے کے لیے ٹھہر گئے۔

پس منظر میں نانگا پربت کے سلسلے کی چوٹیاں
میدان میں سے گزرنے والے شفاف پانی کے دھارے
پہلو میں چیل اور دیودار کا چھوٹا سا جنگل

منظر نامے کی خوب صورتی میں کلام نہیں تھا۔ کلام اس بات پر ہوا کہ ہم اس کی تصویریں بنا کر جیپ ٹریک کی طرف جانا چاہتے تھے، مگر نصرت دین پتھروں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور ہمیں بھی اُسی راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ جیپ کے لیے بنائے گئے راستے پر چلنے کی بجائے گول مٹول پتھروں پر لڑھکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے وضاحت کی کہ جیپ کا راستہ پیدل کے مقابلے میں تین گنا لمبا ہے۔ اگر وہ راستہ اختیار کیا تو جھیل تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو جائے گا اور جھیل کی تصویریں بنانے کے لیے بہت کم وقت ملے گا۔

میرا تجربہ مختلف تھا۔

میدانی علاقوں سے آنے والوں کے لیے بنے بنائے راستے ہی موزوں رہتے ہیں۔

اُن گھڑی پگڈنڈیاں قدم قدم پر روڑے اٹکاتی ہیں۔

نصرت دین کسی پگڈنڈی پر نہیں چل رہا تھا۔ وہ اوپر سے گزرنے والی سڑک کی طرف دیکھتا، کسی جیپ یا موٹر سائیکل پر نشانہ باندھتا اور سیدھی چڑھائی شروع کر دیتا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے تسلیم کیا کہ آج سے پہلے ہمیشہ جیپ ہی پر گیا ہے، یہ راستہ پہلی بار دریافت کر رہا ہے۔

نصرت دین کی دریافت تھوڑی سی کٹھن اور بے ڈھب ضرور تھی، مگر قدم قدم پر دل بہلانے کے نت نئے سامان پیدا کر رہی تھی۔ ہم جوں جوں بلندی کی طرف گامزن تھے، افق پر نمودار ہونے والی دل کشی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ دل کشی نانگا پربت کی برف پوش چوٹیاں تھیں جنھیں دودھیا بادل چوم رہے تھے اور نیل گگن ان کے پس منظر میں رنگ گھول رہا تھا۔

منظر نامے کی یہ خامی البتہ بری طرح کھٹک رہی تھی کہ بادل اور گھٹائیں ہمیں نظر انداز کر کے برف پوش چوٹیوں پر سایہ فگن تھیں۔ اب کوئی پوچھے کہ اتنی ٹھنڈی ٹھار چوٹیوں پر سایہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سائے کی ضرورت تو ہمیں تھی۔

راما جھیل کے راستے پر اس وقت ''چلے ٹھنڈی ہوا تھم تھم'' کا سماں تھا۔ اس کی لاج رکھتے ہوئے

سروں پر چمکتا سورج آگ برسانے سے تو شرما رہا تھا، مگر تپش دل کھول کر لٹا رہا تھا۔

مجاہد قاسمی صاحب نے بادلوں کو رام کرنے کی خاطر محمد رفیع کا ترمیم شدہ گیت چھیڑ دیا:

نیل گگن پر اُڑتے بادل آ آ آ
دھوپ میں جلتا ہم بے چارہ کردے تو سایہ

بادل شاید مسکرا کر آگے بڑھ گئے ہوں، ہم فی الحال مسکرانے کے قابل نہیں تھے۔

بادلوں کی طنزیہ مسکراہٹ نے کیا ستم ڈھایا؟......انتظار فرمائیے۔

مسلسل چڑھائی اور تپش نے ہمارے پسینے چھڑوا دیے۔ پتھروں اور پسینا بہاؤ چڑھائیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نصرت دین اور قاسمی صاحب راما میڈوز سے روانہ ہونے کے چالیس منٹ بعد جیپ روڈ کے اختتام، یعنی گھوڑا اسٹاپ پر پہنچ گئے۔

میں اُن سے دس منٹ بعد پہنچا اور ایک بڑے پتھر پر ڈھیر ہو گیا۔

اس جگہ کئی گھوڑے والے سواری تلاش کر رہے تھے اور کچھ سیاح آرام فرما رہے تھے۔

پڑوسی پتھر پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے مجھے پسینے سے شرابور دیکھا تو پانی کی بوتل بڑھا دی۔ میں نے بلا تکلّف ''جھپٹ'' لی اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اوسان بحال ہوئے تو اجنبی مہرباں کا شکریہ ادا کرنے کا خیال آیا۔ تعارف پر پتا چلا کہ وہ اساتذہ کے ایک گروپ کے ساتھ فیصل آباد سے آئے ہیں۔ استور سے یہاں تک جیپ بک کروائی تھی اور جھیل تک پیدل ٹریک کیا تھا۔

گروپ لیڈر نے واپسی کے لیے جیپ والے کو دو گھنٹے بعد کا وقت دیا تھا، مگر یہ سب لوگ جھیل پر صرف آدھا گھنٹا گزار کر لوٹ آئے تھے۔ اب جیپ کا انتظار ہو رہا تھا۔

میں نے حیرت سے پوچھا:

''آپ اتنی دور سے اور اتنے پیسے خرچ کر کے راما جھیل دیکھنے آئے ہیں، تو جھیل کنارے وقت گزارنے کی بجائے یہاں کیوں تشریف فرما ہیں؟''

اگر اُن کی جگہ میں ہوتا تو اتنے ذاتی سوال پر شاید خفا ہو جاتا اور جواب دیتا:

''پسینے سے شرابور بزرگوں کو پانی پلا کر ثواب کمانے کے لیے۔''

وہ صاحب اتنے منہ پھٹ نہیں تھے؛ بس ایک معنی خیز مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

مگر جوابی سوال داغ دیا کہ ہم لوگوں نے جیپ کی سہولت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟

ان کے انداز اور الفاظ میں معصومیت تھی، مگر لہجے میں چھپا ہوا مفہوم شرارت سے لبریز تھا:

''بڑے میاں! اس عمر میں پنگا لینے کی ضرورت کیا تھی؟ کرایہ نہیں تھا کیا؟''

میں نے صفائی دینے کی بجائے ان کا سوال باتوں باتوں میں اُڑا دیا۔

ان کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ گھوڑا اسٹاپ سے جھیل تک پیدل سفر کرنے کے بعد فطرت کی طرف سے ملنے والا انعام انھیں کچھ خاص پسند نہیں آیا۔

تو کیا جھیل کا منظر نامہ ہمیں بھی مایوس کر دے گا؟

پھر خیال آیا کہ منظر کی دل کشی دیکھنے والے کی آنکھ میں نہیں، ذوقِ جمال میں ہوتی ہے۔

نظر اپنی اپنی...... جمال اپنا اپنا۔

اُس گروپ کا کہنا تھا کہ راما جھیل تک کا راستہ خاصا دشوار ہے۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ مقامی لوگوں نے یہ راستہ جان بوجھ کر مشکل بنا رکھا ہے تا کہ سیّاح کرائے کے گھوڑے یا موٹر سائیکل لینے پر مجبور ہو جائیں۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ نیت ٹھیک ہو تو جیپ جھیل تک جا سکتی ہے۔

مجھے اپنے دوست، ٹریکر اور فوٹو گرافر طارق حمید سلیمانی کا بار ہا دہرایا ہوا قول یاد آیا:

''جہاں سڑک پہنچتی ہے، وہاں سے فطرت اپنا بوریا بستر گول کرنے لگتی ہے۔''

میں نے مقامی لوگوں کی فطرت پسندی کو سراہا اور چاہا کہ کاش جیپ روڈ بھی بند کر دی جائے، تا کہ جو آئے وہ اپنے پسینے کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے راما جھیل کی بارگاہ میں حاضری دے۔

سڑک بنتے ہی یہ فطرت کدہ بھی سیف الملوک جھیل کی طرح عشرت کدہ بن جائے گیا۔

سیف الملوک کے لیے عشرت کدے کی اصطلاح سن کر ایک صاحب شدید برہم ہو گئے۔

وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ جس عشرت کو وہ ذہن میں بسائے بیٹھے ہیں، وہ پُر ہجوم تفریح گاہ اور مزے اُڑانے کے معنوں میں بھی آتی ہے۔ اُن کی غلط فہمی پہلے بحث اور پھر تکرار میں بدل گئی۔

اختلافِ رائے نے اخلاقی گفتگو کو پیچھے چھوڑ دیا، بات شعلہ نوائی تک جا پہنچی۔

اس دوران قاسمی صاحب گاہے گاہے کوئی ''تیلی لگاؤ'' جملہ چھوڑ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔

جب شعلہ نوائی سے آتشیں شعلے اٹھنے لگے تو وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آئے اور سرگوشی کی:

''فطرت پسندی پر لیکچر دینے سے پہلے ذرا سامعین پر نظر ڈال لیا کریں۔ پکنک منانے والوں کے سامنے فطرت کا راگ الاپنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آدمی خود اپنا تماشا بن جاتا ہے۔''

اُن کا راگ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے پسپائی اختیار کی اور جھیل کی طرف قدم بڑھا دیے۔

جیپ پر سوار ہو کر یہاں آنے والوں کے لیے آگے کا راستہ واقعی مشکل تھا۔ اکثر لوگ گھوڑے یا موٹر سائیکل سے استفادہ کر رہے تھے۔ جھیل تک جانے اور واپس آنے کے لیے موٹر سائیکل والے فی سواری پانچ سو سے آٹھ سو؛ اور گھوڑے والے ایک ہزار سے بارہ سو روپے لے رہے تھے۔

ہمیں یہ راستہ ایک طرح کی عیّاشی لگ رہا تھا، نہ سیدھی چڑھائی تھی، نہ اُلٹے پتھر۔ بالشت بھر چوڑے راستے کو موٹر وے سمجھ کر ہم دُڑکی لگانے لگے۔

گھوڑے یا بائیک کے قریب سے گزرتے ہوئے ذرا محتاط رہنا پڑتا تھا، کیونکہ دائیں جانب کی گہری کھائی کے باعث ٹکرانے یا پھسلنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

مجاہد قاسمی صاحب اور نصرت دین آگے نکل چکے تھے۔

راما جھیل کے راستے کا پہلا گلیشیر اتنا بے نام ونشان تھا کہ میرے پیچھے آنے والا ایک گول مٹول اور لال گلال بچہ بلند آواز میں یہ نہ پوچھتا:

''انکل جی میں اس برف پر پھسلوں گا تو نہیں؟''

تو شاید مجھے علم ہی نہ ہوتا کہ گلیشیر گذاری جیسی کوئی حرکت سرزد ہو گئی ہے۔

میں نے واپس جا کر اس کے رُخسار پر بوسہ دیا اور بابا جی کی بجائے انکل کہنے پر شکریہ ادا کیا۔

اُس نے منہ بسور کر ناپسندیدگی ظاہر کی، پھر خبردار کیا کہ پیچھے اس کے والدین بھی آ رہے ہیں۔

میں نے اُس کا بازو پکڑا اور سہارا دے کر گلیشیر پار کروا دیا تو معصوم آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

اپنے ماں باپ کی جھلک دیکھتے ہی اُس نے فخریہ انداز میں وکٹری کا نشان بنایا۔

مگر جب اُنھیں ڈگمگاتے دیکھا تو چمکتی ہوئی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بجھ سی گئیں۔

انھوں نے گلیشیر پار کر لیا تو بچے نے ماں باپ کی ٹانگوں سے باری باری لپٹ کر فتح کا جشن منایا۔

وہ تینوں آگے چلے گئے، مگر دل کے کسی گوشے میں بچے کی فاتحانہ مسکراہٹ دیر تک پگھلتی رہی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد برفانی ڈھلوان سامنے آئی جس پر گلیشیر ہونے کا شک کیا جا سکتا تھا۔

اس تک پہنچنے سے پہلے وادیِ راما نے ایک استقبالیہ تحفہ پیش کر کے قدم روک لیے۔

یہ تحفہ شیشہ ور پانیوں کی ننھّی سی جھیل تھی جسے الگ شناخت دینے اور تھوڑا رومانوی رنگ بھرنے کے لیے مِنی راما جھیل (Mini Rama lake) کا خطاب دیا گیا ہے۔

اِسے مِنی کی بجائے مُنّی کہا جائے تو یہ بدنام نہیں ہوگی، مزید نیک نام ہو جائے گی۔

مُنّی جھیل کا ننھا منّا منظر نامہ فطرت کے نقاش نے اپنی پوری توجہ سے تراشا ہے۔

قدموں میں مُنّی راما جھیل کا نیلگوں پانی جھلملاتا ہے۔

اُس سے آگے سفید گلیشیر کی برفانی ڈھلوان بچھی ہے۔

جس پر رنگ برنگے پیرہن ڈولتے اور ڈگمگاتے ہیں۔

اُن کے پار سبزہ زاروں کی نرم چادر پھیلتی جاتی ہے۔

اور پھر برف کی سفید دھاریوں والی مٹیالی بلندیاں اُبھرتی ہیں۔

سب سے اوپر نیلے آسمان میں بادلوں کے سفید قافلے سبک خرامی سے تیرتے ہیں۔

فطرت کے اوراق پر رنگوں کا اس سے زیادہ دلکش اور حسین امتزاج بھلا اور کیا ہوسکتا ہے!

یہ امتزاج دلکش ہی نہیں، دل فریب بھی تھا۔ دلکشی منی جھیل اور گلیشیر کے رنگین جلووں میں تھی اور دل فریبی گلیشیر عبور کرنے والیوں کی گھبرائی ہوئی، مگر تیکھی اور شوخ نظروں میں۔

یہ دلکشی اور دل فریبی چند لمحے رک کر دل لگانے کا تقاضا کر رہی تھیں۔ میرے ماتھے پر بزرگی کا جھومر سجا دیا گیا تھا۔ ساری دل لگی ایک آدھ تصویر میں سمیٹنا پڑی۔

اللہ پوچھے جھومر سجانے والوں سے۔

اس منظر نگاری سے غلط مطلب نہ لیا جائے۔ مُنّی کی کشش شوخ نظروں کی محتاج نہیں۔

یہ اپنے خاموش حسن کی تپش اور لطیف رنگوں کی برسات سے زائرین کے دل موہ لیتی ہے۔

مُنّی راما جھیل کے لطیف رنگوں کی برسات سے شرابور ہونے کے بعد گلیشیر پار کرنے کا مرحلہ آیا۔ اس مرحلے کی دشواری گلیشیر پر بنی ہوئی ایک تنگ سی کھائی تھی جس میں دو طرفہ ٹریفک چل رہی تھی۔ گھوڑے یا بائیک کے قریب سے گزرتے ہوئے ذرا سا ٹکراؤ پھسلن کا باعث بن سکتا تھا۔ میں گلیشیر کے درمیان میں پہنچا تو ایک ہیوی ویٹ گھوڑے کی لائٹ ویٹ ''سوارنی'' سے ٹکراؤ کا خدشہ پیدا ہوا۔

اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے، میں پھسل گیا...... گلیشیر پر!...... خاتون کے چہرے پر میری بوکھلاہٹ دیکھ کر طنزیہ، یا شاید طربیہ مسکراہٹ ابھری۔

اُس نے گھوڑا رکوا کر بلند آواز میں مشورہ دیا:

''انکل جی رہنے دیں ناں...... آگے کچھ نہیں ہے۔''

ہائے اللہ۔ اِک واری فیر انکل جی!...... انکل جی خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

مشورہ دینے والی بچے سے زیادہ لال گلال تھیں، مگر افسوس کہ بچہ نہیں تھیں۔

دل پر ہاتھ رکھ کر، سر جھکانے اور آداب عرض کرنے پر اکتفا کرنا پڑا۔

گلیشیر کے پار راما جھیل کی قربت کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ جھیل سیف الملوک یا ہنس راج کی طرح چھم سے سامنے نہیں آتی ، بلکہ ناز و انداز دکھاتے ہوئے آہستہ آہستہ پردے اٹھاتی ہے۔ گھونگھٹ اٹھا کر مکھڑے کی تھوڑی سی جھلک دکھائی، پھر دھیرے دھیرے نشیب و فراز میں لے گئی۔ میں انھی نشیب و فراز میں کھویا کھویا چلتا رہا اور چالیس منٹ بعد راما جھیل کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔

مجاہد قاسمی صاحب شاید مجھ سے چند منٹ پہلے پہنچے تھے اور ایک ایسے گلیشیر پر جا چڑھے تھے جو جھیل کی عکس بندی کے لیے موزوں ترین مقام تھا۔

میں بھی اُن کے قریب چلا گیا اور گلیشیر کی برف سے پھوٹتے دودھیا پانی کو جھیل کے سبزی مائل پانیوں میں اُترتے دیکھنے لگا۔

راما جھیل کے مجموعی منظر نامے پر نظر ڈالی تو یہ ''منّی جھیل'' کے رنگ رنگیلے منظر کے مقابلے پر کچھ روکھا پھیکا لگا۔ دوسری نظر نے احساس دلایا کہ یہ بے رنگی راما جھیل کے منظر نامے کا نہیں، میری کم نگاہی کا قصور ہے۔ راما جھیل کے آس پاس فطرت کے وہ تمام عناصر نہایت فراوانی سے پائے جاتے ہیں جو کسی دل رُبا منظر کی تکمیل اور ذوقِ نظارہ کی تسکین کرتے ہیں۔

سرسبز و شاداب راما میڈوز۔ راما گلیشیر۔ راما جھیل کے جھلملاتے پانی اور ان پر سایہ فگن سنگلاخ بلندیاں۔ اور بلندیوں کے عقب میں نانگا پربت کی برف پوش چوٹیاں

ان عناصر کو مختلف، مگر دیدہ زیب انداز میں ترتیب دینا، نقّاشِ فطرت کے فن کا اصل کمال ہے۔

اور ایک جیسے عناصر کو بار بار دیکھ کر، ہر بار نئے رُخ سے لطف اندوز ہونا، پرستار کے ذوق کا۔

جمال و کمال کا حسین بندھن دیکھ کر اس سوال نے سر اُٹھایا کہ گھڑ سوار خاتون نے بابا جی کو ''انکل'' کہہ کر ایک دفعہ تو دل خوش کر دیا، مگر اگلے ہی لمحے ''آگے کچھ نہیں ہے'' کہہ کر توڑا کیوں؟

فطرت کے پرستار سنگلاخ چٹانوں سے بھی سرمستی کشید کر لیتے ہیں، مگر فطرت کی عنایات صرف پرستاروں ہی پر نہیں ہوتیں۔ وہ تماش بینوں کو بھی پروانہ بنانا جانتی ہے۔

فرق بس اتنا ہے کہ تماش بین سرخی پوڈر سے عاری حسن پر نظر نہیں ڈالتے۔

اُنھیں مدھو بالا اور مینا کماری بھی اوپری سجاوٹ کے بغیر ملکہ تاریک شکل کش لگتی ہیں۔
یہ ہماری جوانی کے زمانے کی مثال ہے......آج کے نوجوان؟
مدھو بالا کی بجائے اننیا پانڈے اور مینا کماری کی جگہ جھانوی کپور کے تصور میں کھو جائیں۔
دلچسپی کئی گنا بڑھ جائے گی اور بات پوری طرح سمجھ میں آ جائے گی۔

ہم بھی پوری طرح سمجھ گئے کہ راما جھیل کا روکھا پھیکا تاثر بادلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ تھا۔ قاسمی صاحب کی بے موقع راگنی ''نیل گگن پر اُڑتے بادل آ آ آ'' سن کر نیلے آسمان پر تیرنے والے سارے بادل ہمارے ساتھ ساتھ اُڑتے چلے آئے اور آپس میں گٹھ جوڑ کر کے برف پوش بلندیوں پر چھا گئے۔ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں راما جھیل کا رنگ اُڑ گیا۔
بچاری بلیک اینڈ وائٹ ہو کر رہ گئی۔

دل کش بہت تھی راما، مانا مگر حضورِ
اُن بادلوں کی حرکت اِیک ''لُچ'' سا تل گئیً

راما جھیل سے توقع پوری نہ ہونے کی دوسری وجہ اُس کے نام سے پیدا ہونے والی غلط فہمی ہے۔ اس جگہ فطرت کے حسن کا مرکز جھیل نہیں، بلکہ راما، یعنی سبزہ زار یا میڈوز ہے۔ جھیل راما میڈوز کی زینت بڑھانے کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ تخلیق کار نے شاید راما میڈوز کے پانیوں میں تھوڑی سی کج ادائی بھی گھول رکھی ہے۔ وہ جھیل جیسا ٹھہراؤ نہیں رکھتے اور انگریزی حرف ایل (L) کی شکل میں بہتے ہیں۔ راما جھیل سے مایوس ہو کر لوٹنے والے اگر میڈوز کا درشن کرنے آتے تو بد دل نہ ہوتے۔
یہ ٹھیک ہے کہ بادلوں کی شر انگیزی نے راما جھیل کا رنگ اُڑا دیا تھا۔
مگر پھر بھی، اداس حسن مایوس کن تو نہ تھا۔

راما جھیل سے مایوس ہو کر واپس جانے کی تیسری وجہ دیدار کے لیے غلط وقت اور موسم کا انتخاب تھا۔ اس پتھر کے صنم میں زندگی کی لہر ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں دوڑاتی ہیں۔ ڈھلتی شام میں اس کا خوابیدہ حسن بجھا بجھا ہی رہتا ہے۔
یوں سمجھیے کہ اگر کوئی ''ہائے رے میری بجلی بجلی'' تاڑتے ہوئے جھوم رہا ہو اور سکرین تاریک ہو جائے تو......بجلی میں بھلا کتنی چمک باقی رہتی ہے؟
راما میڈوز کا حسن پھولوں کی اوڑھنی اوڑھ کر نکھرتا ہے، یا پھر برفانی آنچل میں سمٹ کر سنورتا ہے۔

پھولوں میں لپٹے ہوئے حسن کے لیے اگست اور ستمبر فطری انتخاب ہے۔
برفانی جلوے اکتوبر سے فروری، یا زیادہ سے زیادہ مارچ کے وسط تک اپنا جوبن دکھاتے ہیں۔
من مرضی کے موسم میں راما جھیل سے دل رُبائی کی توقع رکھنا، چن جی......حماقت ہے۔
اس ساری تفصیل کا مقصد اپنے مشاہدات کی بنیاد پر یہ عرض کرنا ہے کہ:
ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والے موسم کی پیش گوئی دیکھ کر تشریف لائیں۔
رہے دل کی آنکھ سے دیدار کرنے والے......ہر موسم دیدار کا موسم ......ہر لمحہ دل داری ہے۔

جب چاہو چلے آؤ یہاں دید کی خاطر
یہ آٹھ پہر بیٹھی ہے نظروں کو بچھائے

چلیں جی، ہم نے بادلوں کی سازش ناکام بنا کر راما میڈوز کی وہ رعنائیاں تو دیکھ ہی لیں جو انھوں نے چھپا رکھی تھیں۔ اب اس کا پس منظر بھی سامنے لے آتے ہیں۔
راما جھیل کا پس منظر ۶۸۳۰ میٹر بلند چونگڑہ پیک بناتی ہے جو سلسلۂ نانگا پربت کی ذیلی چوٹی ہے۔
چونگڑہ کے دائیں جانب بلدر اور بائیں طرف رائے کوٹ پیک ہے۔

رائے کوٹ کے بائیں جانب نانگا پربت ہے جو دراصل ایک سے زیادہ چوٹیوں کا نام ہے، اسی لیے سلسلۂ نانگا پربت کہلاتا ہے۔ اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی سطح سمندر سے ۸۱۲۶ میٹر بلند ہے اور مرکزی چوٹی (MAIN PEAK) یا سمٹ پیک (SUMMIT PEAK) کہلاتی ہے۔

نانگا پربت کہلانے کی حق دار صرف سمٹ پیک ہے۔ مگر یہ چوٹی راما میڈوز یا فیری میڈوز سے نظر نہیں آتی۔ نانگا پربت کا دیدار دونوں جگہ ادھورا رہتا ہے۔ ادھورے دیدار کو پورا کرنے کا خواب میں نے نانگا پربت ''عبور'' کرنے والے دنیا کے اکلوتے کوہ پیما، رائن ہولڈ میسنر سے ملاقات کے بعد دیکھا تھا۔
یہ خواب، پربت کے اُس پار ہمارا منتظر تھا۔ البتہ کچھ جھلکیاں راما جھیل میں بھی ٹمٹما رہی تھیں۔
یہ جھیل چونگڑہ پیک کا بیس کیمپ ہے۔

نانگا پربت بیس کیمپ بھی بن سکتی تھی کیونکہ اس راستے سے سمٹ پیک تک پہنچنا ممکن ہے۔ ایک جرمن ٹیم نے ۱۹۳۰ء میں چونگڑہ پیک کے راستے نانگا پربت سر کرنے کے لیے سروے کیا تھا اور پوری منصوبہ بندی کر لی تھی۔ مگر یہ کوشش راستے میں دم توڑ گئی، چونگڑہ پیک سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس ناکامی کی وجہ سے ''راما فیس بیس کیمپ'' کی اصطلاح بھی دم توڑ گئی، رائج رہتی تو راما کی شان نرالی ہوتی۔

راما کی تصویر کشی کرتے ہوئے پچھتاوے کا احساس بھی ساتھ ساتھ رہا۔ کاش ہم اپنا کیمپ لے آتے اور جھیل کنارے رات گزار کر طلوعِ آفتاب کے وقت راما دیوی کا اصل رنگ روپ دیکھتے۔

ویسے تو ہر جھیل اپنی قربت میں رات گزارنے اور تارے گننے کا مطالبہ کرتی ہے۔

راما جھیل کی فطری کیمپ سائٹ یہ مطالبہ کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہے۔

ہمارے ذہن پر روپل فیس بیس کیمپ سوار تھا۔ ٹریک کا آغاز اگلے روز کرنا تھا اور ہم ابتدائی انتظامات بھی نہ کر پائے تھے۔ صرف دو گھنٹے بعد راما جھیل کو الوداع کہنے پر مجبور ہو گئے۔

فطرت کی بارگاہ میں کیسے کیسے گستاخ گھس آتے ہیں؟

اسی لیے کان پکڑ کر نکال دیے جاتے ہیں!

راما جھیل سے نکالے جانے کے بعد ہم اپنے ہوٹل میں واپس آ گئے۔

منیجر نے عاقل استوری صاحب کا پیغام پہنچایا کہ ٹریک کے سلسلے میں روپل ہوٹل کے مالک عبدالرؤف سے ابتدائی بات چیت ہو چکی ہے، ہمیں چاہیے کہ فوری طور پر اُس سے رابطہ کر لیں۔

مدینہ گرین ہوٹل سے روپل ہوٹل کا کرایہ تین سو سے چار سو روپے ہے۔

نصرت دین ہمیں وہاں لے گیا اور عبدالرؤف سے تعارف کروایا۔ ہمارے اصرار کے باوجود اُس نے اضافی کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور دو سو روپے سے زیادہ کا پٹرول مفت میں پھونک ڈالا۔

مجھے ایک پیشہ ور ڈرائیور کے اتنے غیر پیشہ ورانہ رویّے پر شدید حیرت ہوئی۔

اس ''حماقت'' کے لیے ذرا مختلف قسم کی شخصیت درکار ہوتی ہے۔

نصرت دین کا رویّہ بتا رہا تھا کہ وہ پیشہ ور ڈرائیور بن تو گیا ہے، مگر پیشہ کرنے کے گر نہیں سیکھے۔

میں نے تجسس دور کرنے کے لیے اس ''خرابی'' کی وجہ پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ باباجی کی صورت میں اُسے اپنے پیرومرشد کی جھلک نظر آتی ہے، وہ ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

اُس کی وضاحت سن کر میں نے کچھ شوخ اور کچھ مشکوک نظروں سے باباجی کو گھورا۔

قاسمی صاحب کے ابا حضور اپنے زمانے میں مانسہرہ کے مشہور و معروف روحانی پیشوا تھے۔ مریدوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی جاتی ہے۔ بیٹے تک اُن کی تھوڑی بہت کرامات ضرور پہنچی ہوں گی۔

بچارا نصرت دین...... پتا نہیں راضی خوشی پھنسا تھا یا کوئی کرامت ''چلا'' کر پھنسایا گیا تھا۔

ہمیں اُس سے پوری ہمدردی ہے، مگر ٹریک بھی تو کرنا ہے۔ آیئے ذرا عبدالرؤف سے مل لیں۔

استور آ کے دیکھو پراگندہ طبع لوگ

دو آنکھیں بارہ ہاتھ......ممتو کی تلاش تک......دیسی بابوں کا جوڑا......استور سے ترشنگ

عبدالرؤف نے جب سنا کہ میں اور مجاہد قاسمی صاحب لاتوبو بیس کیمپ ٹریک کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس بجٹ بہت کم ہے، تو شاید اُسے یقین نہ آیا۔

''ہوں۔ دو آدمی۔ بس دو آدمی۔'' اُس نے عجیب سے انداز میں دہرایا۔

ہم لاکھ چاہتے ہیں کہ بات بات پر فلموں کی بات نہ آئے، مگر کوئی نہ کوئی بات ٹریک سے اتار ہی دیتی ہے۔ عبدالرؤف کو اس وقت بھلا ''دو آدمی'' والا مکالمہ بولنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک کا افتتاح گبر سنگھ کے مکالمے سے؟......اللہ معافی

ہم نے حیرت اور بے یقینی کی وجہ پوچھی تو عبدالرؤف نے بتایا کہ صرف دو آدمی ہوں تو اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور کم بجٹ میں ٹریک کروانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چار چھ افراد ہوں تو جیپ کا کرایہ اور بار برداری کے اخراجات تقسیم ہو جاتے ہیں۔ بے یقینی کی دوسری وجہ بہت دلچسپ تھی:

دیسی بابوں کا جوڑا...... جسے وہ پتا نہیں کیوں جوڑی سمجھ رہا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ غیر ملکی جوڑوں اور ''جوڑیوں'' کے لیے کئی بار انتظام کر چکا تھا۔

سٹھیائی ہوئی ملکی جوڑی پہلی بار پلّے پڑی تھی، اس لیے یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد اُس نے تسلی دی:

''آپ اس عمر میں نکل ہی آیا ہے تو ہم پوری کوشش کرے گا کہ آپ لوگ لاتوبو پہنچ جائے۔''

ہم نے ''کوشش'' کے بارے میں وضاحت چاہی۔ اس نے بتایا کہ روپل اور لاتوبو میں اُس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ وہ اُن سے رابطہ کر کے پروگرام ترتیب دے لے گا۔ ترشنگ کے لیے جیپ روپل ہوٹل کے سامنے سے جاتی ہے۔ ہم کل صبح دس بجے اپنی تیاری مکمل کر کے آ جائیں۔ وہ جیپ میں نشستیں محفوظ کروا دے گا اور ٹریک کے لیے بھی کوئی نہ کوئی انتظام کر ہی لے گا۔

اِس ادھورے وعدے پر پورا یقین کرنا مشکل تھا، مگر اس وقت ہم اور کیا کر سکتے تھے؟

ہماری اپنی بنائی ہوئی آئٹنیری (ITINERARY) کے مطابق کل ترشنگ گاؤں میں قیام کا دن تھا

اور وہیں سے روپل گاؤں کے لیے جیپ اور بیس کیمپ ٹریک کے لیے پورٹرز کا بندوبست کرنا تھا۔ عبدالرؤف اگر کوئی مناسب انتظام کرنے میں کامیاب نہ ہوتا، تب بھی ہم اپنے پروگرام پر عمل کر سکتے تھے۔ اس لیے تھوڑا سا اطمینان ہوا اور ہم واپس آ گئے۔

ہوٹل پہنچ کر اوپر تلے دو حماقتیں سرزد ہوئیں۔ پہلی ہم سے، دوسری نصرت دین سے۔

ہماری حماقت یہ تھی کہ سموسا نما بلتی فاسٹ فوڈ ''ممتو'' کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

نصرت دین نے حماقت پر حماقت کرتے ہوئے ہمیں ممتو کھلانے کا بیڑا اُٹھا لیا۔

پہلی کوشش استور بازار میں کی گئی، مگر ''سپیشل ممتو کارنر'' بند ملا۔ پھر لاری اڈّے پہنچے تو ممتو کی مشہور ریڑھی بھی ہٹ چکی تھی۔ عیدگاہ بازار میں ''راجپوت ممتو شاپ'' کا پتا چلا تو نصرت دین نے وہاں جانے کے لیے گاڑی موڑ لی۔ عیدگاہ کے روپل ہوٹل سے ہم ابھی واپس آئے تھے۔

میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ ہمیں ممتو کھانے میں چنداں دلچسپی نہیں، محض دیکھنے میں تھی۔

عبدالبصیر تاجور صاحب کو اس کی شکل اتنی ناگوار ہے کہ وہ اسے چکھے بغیر اُن کھانوں میں شامل کر چکے ہیں جنھیں ساری عمر منہ نہ لگانے کی قسم کھا بیٹھے ہیں۔ ہم ممتو کی صورت میں اُن کے ذوقِ سلیم کا دیدار کرنا چاہتے ہیں اور اتنی سی بات کے لیے دو تین لٹر پٹرول پھونکنا نری حماقت سمجھتے ہیں۔

مگر نصرت دین مرشد کی خدمت اقدس میں ممتو کا نذرانہ پیش کر کے ثوابِ دارین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری بات سنی اَن سنی کر دی اور عیدگاہ کی راجپوت ممتو شاپ کے سامنے پہنچ کر بریک لگائے۔

وہاں تالا لٹکتا نظر آیا تو نصرت دین کا منہ بھی لٹک گیا۔

اُس نے بار بار معذرت کی کہ پوری کوشش کے باوجود مہمانوں کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔

ذرا تم ہی سوچو...... ممتو کی خاطر...... یوں پھیرے لگانا...... حماقت نہیں ہے...... تو پھر اور کیا ہے؟

نصرت دین نے جاتے جاتے پیشکش کی کہ ہم کل دس بجے تیار ہو کر اُسے فون کر دیں، وہ ہمیں روپل ہوٹل پہنچا دے گا۔ ہمارے اصرار کے باوجود اُس نے ''ممتو پھیرے در پھیرے'' کا کرایہ نہیں لیا اور بیس کیمپ ٹریک کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

عاقل استوری کی پریشانیاں...... عبدالرؤف کی تسلیاں...... نصرت دین کی ممتو پھیریاں

استور آ کے دیکھو پراگندہ طبع لوگ
کچھ میر ہی کی خاص یہ عادت نہیں رہی

نصرت دین کے رخصت ہوتے ہی ہم بستروں پر دراز ہو گئے۔ نیند کے جھونکے آنے ہی لگے تھے کہ بے ہنگم شور و غل کی وجہ سے آنکھ لگنا دشوار ہو گیا۔ کافی دیر تک سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور کہاں ہو رہا ہے۔ پھر اندازہ ہوا کہ آوازیں ڈائننگ ہال سے آ رہی ہیں۔

میں نے کچھ دیر تک برداشت کیا۔ پھر باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

پانچ چھ افراد کی ایک ٹولی نیم دائرے میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھی۔ نازیبا فقروں کی دھول اڑ رہی تھی اور طبلے کی جگہ ڈائننگ ٹیبل استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے آنکھیں ملتے دیکھ کر وہ لوگ میری پریشانی سمجھ جائیں گے اور آوازیں دھیمی کر لیں گے۔ مگر وہ اپنے شغل میں مگن رہے۔

میں نے درخواست کی کہ وہ اگر ہلا گلا کرنا چاہتے ہیں تو کیمپ فائر کے لیے بنائے گئے چبوترے پر تشریف لے جائیں یا اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے شوق پورا کر لیں۔ وہ خاموش ہو گئے۔ میں مطمئن ہو کر کمرے میں واپس جانے ہی لگا تھا کہ سب کے سب ہم آواز ہو کر دوبارہ شروع ہو گئے:

''ہنگامہ ہے کیوں برپا؟ تھوڑی سی جو پی لی ہے۔ ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی ہے......''

میں حیران پریشان ہو کر اُن کی شکل تکنے لگا۔ اور تکتا ہی رہا تو ایک صاحب نے فرمایا:

''بابا جی ہمیں مشورہ دینے کی بجائے دو چار گھنٹے تازہ ہوا کھا آئیں۔ تھک گئے تو نیند خود بخود آ جائے گی۔ ہم یہاں کمرے میں بند ہو کر تسبیح گھمانے نہیں آئے۔ ہمارے ساتھ خواہ مخواہ پنگا نہ لیں۔''

یہ صاحبان شاید نو دولتیے تھے، یا اندھی طاقت کے نشے میں چور۔ یا پھر اُس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں طبلے کی تھاپ کے بغیر راتیں سونی سونی لگتی ہیں۔

طبلے کے منہ لگنے میں اپنا ہی نقصان تھا۔ میں کان لپیٹ کر کمرے میں واپس چلا آیا۔

نیند کی دیوی سب کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کرتی۔ کسی سے رات گئے تک روٹھی رہتی ہے اور کسی کو آغوش میں لے کر سہانے سپنے دکھاتی ہے۔ قاسمی صاحب شاید نیند کے چہیتے شہزادے ہیں۔ بالیں پہ ہونے والے شورِ قیامت کے باوجود جس کروٹ سوئے تھے اُسی کروٹ سوئے رہے۔

میں سوتے جاگتے کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ رات کے پچھلے پہر طوفانِ بازاری سے نجات ملی تو سکون کے لمحات میسر آئے۔

قاسمی صاحب منہ اندھیرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بھی جگا دیا۔

میں نے کسمساتے ہوئے کچھ دیر صبر کرنے کی درخواست کی تو اُنھوں نے پُرجلال لہجے میں فرمایا:

''اللہ نے فجر کے وقت اپنے بندوں پر نماز اور فطرت نے اپنے پرستاروں پر فوٹو گرافی فرض کردی ہے۔ یہ فرائض کسی صورت معاف نہیں ہو سکتے۔ آنکھیں ملنا چھوڑ کر فوراً تیار ہو جائیں اور دونوں فرائض وقت پر ادا کریں۔''

میں نے وضو کیا اور میز پر رکھی ہوئی جائے نماز اُٹھائی۔ قاسمی صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ مسجد قریب ہے اور جماعت کا وقت ہونے والا ہے۔ فجر کی نماز با جماعت ادا کی جائے گی۔

مجاہد قاسمی صاحب پر غالباً گذشتہ روز ہونے والے مرید کی ''صحبت'' کا اثر ہو گیا تھا اور وہ خود کو جگت مرشد سمجھ بیٹھے تھے۔ میں پیری مریدی پر یقین نہیں رکھتا، اس لیے ان کا حکم سنا ان سنا کر دیا اور جائے نماز بچھا کر نیت باندھ لی۔ قاسمی صاحب نے قلندرانہ جلال کے عالم میں کیمرا اُٹھایا اور ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی دھڑلّے سے دروازہ بند کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

میں سلام پھیرتے ہی ایک مرتبہ پھر بستر میں جا گھسا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو قاسی صاحب میرے کیمرے کی تصویریں ری پلے کر کے دیکھ رہے تھے۔

مجھے جاگتے دیکھ کر شگفتہ لہجے میں فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب دن نکل آیا ہے، اب جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میں ناشتے کے لیے مسجد کے قریب بہت اچھا ہوٹل دیکھ آیا ہوں۔''

مجاہد قاسمی صاحب کے لہجے میں خفگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اُن کی یہی ادا ''تھاں'' مار جاتی ہے۔ میں نے رات کا واقعہ سنا کر اپنے تساہل کی وضاحت کی تو زبان کے ساتھ اُن کا دل بھی صاف ہو گیا اور سدابہار چہرے پر مزید بہار اُتر آئی۔ ہم نہا دھو کر تیار ہوئے اور کمرے سے باہر نکلے۔

ڈائننگ ٹیبل پر رات کے وقت طبلہ سرائی کرنے والی ٹولی براجمان تھی۔ اُن کے ساتھ چند جانے پہچانے سٹائل دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ صاحبان جس نشے میں مخمور تھے وہ کم از کم دس بارہ سال تک اتارے نہیں اترتا۔ مجھے احساس تھا کہ ایک معمولی سے واقعے کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ مگر کیا کرتا؟ ان لوگوں کی طرف سے ہونے والی عزّت افزائی ''ٹھاہ کر کے'' دل پر لگی تھی۔

ناشتے کے بعد استور بازار کا چکر لگایا۔ میرے پاس ٹریکنگ شوز اور سٹک نہیں تھی۔

راولپنڈی میں خریدنے کا ارادہ کیا تو قاسمی صاحب نے فرمایا کہ ٹریکنگ کا سامان راولپنڈی کی بجائے استور سے خریدنا بہتر رہے گا۔

کوہ پیماؤں کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے مجاہد قاسمی صاحب شاید استور کو گلگت کی جڑواں بہن سمجھ بیٹھے تھے۔ اُن کا خیال غلط ثابت ہوا۔ استور بازار میں ٹریکنگ سٹک اور شوز دستیاب نہیں تھے۔ مجبوراً جوگرز پر گزارا کرنا پڑا۔ سڑک کنارے لنڈے سے خریدے گئے یہ جوگرز قدرے تنگ تھے۔

میں نے یہ سوچ کر خرید لیے کہ ضرور کسی گوری کے نرم و نازک پاؤں سے اترے ہوں گے، گوروں کے پاؤں اتنے چھوٹے نہیں ہوتے۔

''بزرگی اپنی جگہ......دل پشوری اپنی جگہ!''

ٹریک کے لیے درکار دیگر چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر ہم کمرے میں آئے اور خیمے کے علاوہ باقی سب سامان ایک ہی بیگ میں پیک کر لیا۔ ٹریک کا دورانیہ اگر ایک ہفتے سے کم ہو تو ٹراؤزر اور شرٹ کے دو جوڑوں اور ایک برساتی سے کام چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قاسمی صاحب نے واٹر پروف جیکٹ کے ساتھ صرف ایک شلوار سوٹ بیگ میں رکھا۔ باقی سامان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ روپل ہوٹل میں چھوڑ جائیں گے اور واپسی پر اٹھا لیں گے۔

ساڑھے نو بجے ہم تیاری مکمل کر چکے تھے اور تذبذب کا شکار تھے کہ نصرت دین کو فون کریں یا کسی اور گاڑی کا بندوبست کر لیں۔ ہمیں خدشہ تھا کہ نصرت دین کرایہ نہیں لے گا۔ ہم اُس پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے۔ قاسمی صاحب ٹیکسی کا پتا کرنے بازار کی طرف چلے گئے؛ اور چند منٹ بعد نصرت دین کی بانہوں میں باہیں ڈالے واپس چلے آئے۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر صرف نصرت دین کی ٹیکسی کھڑی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی اُسی کی خدمت میں درخواست پیش کرنا پڑی۔ مرید کی گرویدگی آج بھی تین چار سو روپے کا نذرانہ پیش کرنا چاہتی تھی، پیر صاحب شرفِ قبولیت بخشنے پر مجبور ہو گئے۔

نصرت دین نے ہمیں روپل ہوٹل پہنچا کر عبدالرؤف کے حوالے کیا اور خود ٹیکسی سٹینڈ کی طرف واپس چلا گیا۔ شکریہ نصرت دین

عبدالرؤف کل شام بالکل فارغ تھا، مگر آج لگ رہا تھا جیسے روپل ہوٹل کی تمام مصروفیات اُس کے دو ہاتھوں میں سمٹ آئی ہوں۔ مجھے کافی دیر تک سمجھ نہ آیا کہ وہ ٹماٹر کاٹ رہا ہے، کڑاہی میں گوشت بھون رہا ہے، یا کیتلی میں چائے انڈیل رہا ہے۔ کسی گاہک کو چائے یا کھانا پیش کرتے وقت وہ ہم پر اچٹتی ہوئی ترچھی نظر ڈالتا اور آنکھوں سے ''تسلّی رکھیں'' کا پیغام دے جاتا۔

اکھیوں ہی اکھیوں میں تسلّی کرتے کرتے آدھا گھنٹا گزر گیا تو قاسمی صاحب نے حکم دیا کہ میں

کچن میں جا کر عبدالرؤف سے کوئی واضح جواب لوں۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ کچن میں میرا داخلہ پسند نہیں کرے گا۔مگر اُس نے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا اور دیوار کے سہارے رکھی ہوئی لنگڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنی مصروفیت میں خلل ڈالے بغیر اُس نے موبائل فون اُٹھایا اور کسی جیپ ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دی۔ میرے لیے ایک نئی اُلجھن کھڑی ہوگئی۔

اب میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عبدالرؤف فون پر ڈرائیور سے بات چیت میں مصروف ہے یا مجھ سے ٹریک کے بارے میں سوال و جواب کر رہا ہے؟ سلاد کی پلیٹ پر لیموں نچوڑ رہا ہے یا چائے کی پیالیاں دھو کر برتنوں کے ٹوکرے میں رکھ رہا ہے۔ کل شام عبدالرؤف کے الفاظ نے فلم کا مکالمہ یاد دلایا تھا، آج اُس کی حرکات ایک مشہور فلم کا نام یاد دلا رہی تھیں۔ ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ''

دو ہاتھوں سے بارہ ہاتھوں کا کام لینے والی کرامت میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ کرامت دیکھتے دیکھتے ایک گھنٹا گزر گیا تو عبدالرؤف نے ٹریک کا ''عین جبر دست'' انتظام ہونے کی نوید سنائی۔

انتظامات کی تفصیل یہ تھی کہ استور سے ترشنگ تک پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کیا جائے گا۔

ترشنگ سے روپل کے لیے سپیشل جیپ لینا پڑے گی کیونکہ وہاں پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں ہے۔ سپیشل جیپ کا کم از کم کرایہ پندرہ ہزار روپے چل رہا ہے مگر عبدالرؤف کی سفارش پر ایک مہمان نواز ڈرائیور خاص الخاص رعایت کرتے ہوئے بارہ ہزار پر رضامند ہو گیا ہے۔

جیپ روپل گاؤں سے آگے، جیپ سٹاپ پر پارک کر دی جائے گی۔ ڈرائیور بطور گائیڈ اور پورٹر لاتوبو بیس کیمپ تک ہمارے ساتھ جائے گا۔ ناشتے اور رات کے کھانے کا انتظام اُسی کی ذمّہ داری ہوگی۔

دوپہر کے وقت لنچ سٹاپ نہیں کیا جائے گا۔ چلتے پھرتے لنچ کے لیے نمکو، چاکلیٹ، بسکٹ اور ڈرائی فروٹ وغیرہ کا انتظام ہمیں خود کرنا ہوگا۔ البتہ کسی بکروال بستی سے مانگی تانگی چائے پیش کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ان خدمات کا معاوضہ آٹھ ہزار روپے ہوگا۔

ہم خود بھی ٹریک کے دوران لنچ سٹاپ کے عادی نہیں ہیں، اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

ترشنگ سے لاتوبو بیس کیمپ ٹریک کا دورانیہ دو سے تین دن ہے۔

عبدالرؤف نے اطمینان دلایا کہ ایک آدھ دن زیادہ لگ گیا تب بھی معاوضے کی رقم میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ عبدالرؤف کی تجاویز بظاہر اطمینان بخش تھیں۔ ٹریک کے منتظم اعلیٰ جناب حسین احمد مجاہد قاسمی مدظلہ العالی اور دام برکاتہم وغیرہ وغیرہ نے خلافِ عادت سودے بازی کی کوشش نہیں کی۔ چند

سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کر کے مراقبے میں گئے اور عبدالرؤف کا پروگرام جوں کا توں قبول کر لیا۔

ٹریک کے انتظامات کا بوجھ شانوں سے اُترتے ہی ہم ذہنی طور پر آزاد ہو گئے۔

جیپ روانہ ہونے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت باقی تھا۔

ہم عیدگاہ میں ثقافتی تصویریں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

عیدگاہ کا علاقہ ضلع استور کا انتظامی مرکز ہی نہیں، استور شہر کی اصل خوب صورتی کا مرکز بھی ہے۔ یہ سرسبز و شاداب مرکز وادیِ استور کے حسن کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ قاسمی صاحب نے حسبِ عادت چند بچوں اور بچیوں کو گھیر گھار کر تصویر کا ماڈل بننے پر آمادہ کر لیا۔ اس شغل میں ایک گھنٹا با آسانی گزر گیا۔

استور تشریف لائیں تو عیدگاہ بازار کے عقب میں تھوڑا سا اوپر جا کر وادی کا منظر ضرور دیکھیں۔

ہم اس منظر سے لطف اندوز ہو کر روپل ہوٹل واپس آئے تو ایک طرف ترشنگ جانے والی جیپ تیار تھی، دوسری طرف عبدالرؤف بیس کیمپ کا انتظام منسوخ ہونے کا اعلان فرما رہا تھا۔ ہم شدید پریشان ہو گئے، شانوں سے اُترا ہوا بوجھ دُگنا ہو کر سوار ہو گیا۔ ہم نے عبدالرؤف سے شکوہ کیا:

تری دل بری پہ قرباں تری رہبری کے صدقے
مرا وقت بھی گنوایا مری راہ بھی گنوائی

عبدالرؤف نے اچانک منسوخی کی وجہ بتاتے ہوئے وضاحت کی کہ ترشنگ والے ڈرائیور کے جال میں شاید کوئی اور مرغا پھنس گیا ہے اور اُس نے بارہ ہزار کی بجائے سولہ ہزار کا مطالبہ کر دیا ہے۔ مارکیٹ ریٹ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار چل رہا ہے۔

عبدالرؤف کا کہنا تھا کہ جیپ ڈرائیور کے ساتھ اُس کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ مہمانوں کا حق کیونکہ دوستوں سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے اُس نے ہمارے مالی مفادات کی خاطر اپنے ہم وطن دوست کی بلیک میلنگ مسترد کر دی ہے۔ اُس کی ''حق نوازی'' سے پریشان ہونا فطری امر تھا۔

ہم نے اپنا سامان اُٹھایا اور جیپ میں سوار ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔

عبدالرؤف نے جیپ ڈرائیور کے پاس جا کر کچھ دیر کھسر پسر کی۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے اترتے ہوئے اعلان کیا کہ ظہر کی اذان ہو چکی ہے، ترشنگ کے لیے روانگی نماز کے بعد ہوگی۔

ہمیں نہ جانے کیوں دال میں کچھ کچھ کالا نظر آیا اور یہ اچانک اعلان گراں گزرا۔

ترشنگ پہنچنے میں تاخیر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ اب ہمیں صرف مناظر سے لطف اندوز

نہیں ہونا تھا، جیپ اور پورٹرز کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

ہمیں علم نہیں تھا کہ نماز کے وقفے پر اعتراض کی صورت میں توہین مذہب کے قانون کی کون کون سی دفعات لگ سکتی ہیں۔ اس لیے زندہ جلائے جانے کا خطرہ مول نہیں لیا اور سامان جیپ کی چھت پر رکھوا کر قریبی مسجد کا رُخ کیا۔ نماز ادا کر کے واپس آئے تو عبدالرؤف نے ریستوران میں بیٹھ کر انتظار کرنے کا مشورہ دیا اور انکشاف کیا کہ جیپ تقریباً ایک گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔

ہمیں اس چکر پھیری نے چکرا کر رکھ دیا، مگر انتظار کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

روپل ہوٹل کے ایک حصّے میں میز کرسیاں رکھی گئی تھیں اور دوسرے میں چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر دری بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔ یہ چبوترہ فرشی دسترخوان کے علاوہ انتظار گاہ اور آرام گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ رات کے وقت خواب گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہوگا۔ ہم چبوترے کے ایک گوشے میں نیم دراز ہو گئے۔

عبدالرؤف چند منٹ بعد ہمارے پاس آیا اور دوپہر کے کھانے کی پیشکش کی۔ ہم نے بتایا کہ فی الحال کھانے کی گنجائش نہیں ہے اور پوچھا کہ جیپ کی روانگی میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟

عبدالرؤف جیپ کے بارے میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا مگر ہمارے انکار کے باوجود پلاؤ کی دو پلیٹیں لے آیا اور محبت آمیز لہجے میں کھانے کے لیے اصرار کیا۔

ہم نے مزید انکار ناشکری سمجھا اور ایک پلیٹ قبول کر لی۔ کھانے کے بعد چائے بھی پیش کی گئی۔ تازہ دودھ کی لب سوز و لب دوز چائے کا دوسرا کپ ہم نے خود فرمائش کر کے منگوایا۔

چائے کا دور ختم ہونے سے پہلے عبدالرؤف چہرے پر لمبی چوڑی مسکراہٹ سجائے ایک نوجوان کے ساتھ تشریف لایا اور فخریہ انداز میں اعلان کیا:

''ڈاکٹر صاحب آپ کے ٹریک کا ایک دم فرسٹ کلاس انتظام ہوگیا ہے۔ یہ ندیم حسین ہے، لاتوبو تک آپ کے ساتھ جائے گا اور ٹریک کے تمام مسائل حل کرے گا۔''

عبدالرؤف نے بتایا کہ ندیم حسین روپل گاؤں کا رہائشی ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ استور آیا ہوا تھا، اب واپس جا رہا ہے۔ جیپ عام طور پر ترشنگ تک جاتی ہے، مگر آج روپل کی چھ سات سواریاں اکٹھی ہوگئی ہیں اس لیے ڈرائیور روپل تک جانے پر رضامند ہوگیا ہے۔ ہم آج رات روپل پہنچ کر ندیم حسین کے گھر قیام کریں گے اور صبح سویرے ٹریک شروع کر دیں گے۔

ندیم حسین گائیڈ اور پورٹر کے طور پر ہمارے ساتھ لاتوبو بیس کیمپ تک جائے گا اور قیام و طعام کا بندوبست کرے گا۔ ان سب خدمات کی ''فیس'' پندرہ ہزار روپے ہوگی۔

یہ پروگرام ہمیں جیپ والے کی نسبت بہتر لگا۔ روپل تک سفر اور گائیڈ کے گھر ایک رات قیام کے دوران ہم اُس سے مانوس ہو جائیں گے اور پانچ ہزار روپے کی بچت بھی ہو جائے گی۔

حاصل شدہ معلومات کے مطابق جیپ ٹریک روپل سے تقریباً آدھا کلومیٹر آگے ختم ہوتا تھا۔ اب ہمیں یہ فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ اتنے سے فاصلے کے لیے پانچ ہزار کی بچت خسارے کا سودا نہیں تھا۔ چند منٹ مشورہ کرنے کے بعد ہم نے عبدالرؤف کی تجویز منظور کر لی۔

ہمارے مذاکرات مکمل ہوتے ہی جیپ ڈرائیور نے روانگی کا اعلان کر دیا۔

ہمیں تاخیر کی اصل وجہ اب سمجھ آئی۔ استور میں ہر کام نہایت سکون اور اطمینان سے کیا جاتا ہے۔ جیپ ڈرائیور بھی نہایت اطمینان سے ندیم حسین کا انتظار کر رہا تھا۔ اس انتظار کا فائدہ ہمیں بھی پہنچا۔ ترشنگ پہنچ کر انتظامات کرنے کا بوجھ ایک مرتبہ پھر شانوں سے اتر گیا۔

ہم نے اس ہنگامی بندوبست کے لیے عبدالرؤف کا شکریہ ادا کیا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔

استور سے نکلتے ہی سڑک نے تیور بدل لیے۔ جیپ نے اچھل کود شروع کر دی اور سر سے سر ٹکرانے لگا۔ مناظر کا رنگ بھی یکساں ہی تھا۔ بائیں جانب نشیب میں بہتے ہوئے دریائے استور کے مٹیالے پانی اور دائیں جانب سنگلاخ پہاڑ جن پر کہیں کہیں ہریاول نظر آ جاتی تھی۔

استور سے تقریباً آٹھ کلومیٹر فاصلے پر وادی کشادہ ہونا شروع ہوئی اور دس کلومیٹر فاصلے پر سفر کا پہلا قابل دید منظر ''گوری کوٹ'' کی رنگین صورت میں سامنے آیا۔

گوری کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے ترشنگ روڈ قدرے بلندی پر آ جاتی ہے، اس لیے منظر نامے میں اس قصبے کا داخلہ فطرت کے لگائے ہوئے فلمی سیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب پلیٹ فارم پر سجے رنگا رنگ مکانات حسنِ تعمیر اور ذوقِ ترتیب کا دلکش نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

نانگا پربت کی سفید پوش بلندیاں اس رنگین منظر کے لیے بہترین پس منظر مہیا کرتی ہیں۔

یہ قصبہ اس لیے کچھ زیادہ ہی دل کش لگ رہا تھا کہ آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کے درمیانی خلا سے گزر کر آنے والی کرنیں اندھیرا اُجالا ڈرامے کی شوٹنگ کر رہی تھیں۔

اپنی گاڑی یا بائیک پر شاہراہِ قراقرم سے دیوسائی، منی مرگ، کالا پانی ویلی اور ترشنگ جانے

والوں کے لیے گوری کوٹ ایک خوب صورت پڑاؤ ہے۔ اس قصبے میں قیام وطعام استور کی نسبت مہنگا ہے مگر کشادہ وادی کا منظر نامہ گرانی کی تلافی کر دیتا ہے۔

جیپ ڈرائیور نے گوری کوٹ میں طویل وقفہ کیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ جیپ میں سوار ایک خاتون اپنے قریبی عزیز کی عیادت کرنا چاہتی ہیں۔ خاتون نے پندرہ بیس منٹ میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر صدیوں سے چلی آنے والی روایات بھلا کیسے ٹوٹ سکتی تھیں؟

محترمہ نہایت سکون واطمینان سے تقریباً ایک گھنٹے بعد تشریف لائیں۔

پندرہ بیس منٹ اُن سواریوں کے انتظار میں گزر گئے جو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ ہم بھی نکل گئے تھے۔ اس بہانے گوری کوٹ سے تعارف کا موقع مل گیا۔

گوری کوٹ سے آگے منظروں کی دنیا بدل جاتی ہے۔ ایک پل پار کرتے ہی برزل پاس سے آنے والے صاف وشفاف پانی دریائے استور کے مٹیالے پانیوں سے سنگم بناتے ہیں۔ یہ ایک عام سا منظر ہے، مگر دو مختلف رنگوں کے پانیوں کا ملن چند منٹ رُک کر نظارہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

برزل نالے کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک چلم چوکی پہنچتی ہے جہاں سے اس کی ایک شاخ دیوسائی اور دوسری منی مرگ چلی جاتی ہے۔ ہمارا سفر دریائے استور کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔

برزل استور سنگم سے آگے نانگا پربت سلسلے کی برف پوش چوٹیاں، چونگڑہ پیک اور رائے کوٹ پیک، درشن دینے لگتی ہیں۔ سمٹ پیک نظروں سے اوجھل ہی رہی اور ہم چورِت نامی قصبے سے گزرتے ہوئے ترشنگ گاؤں پہنچ گئے۔

ہمارے قریب بیٹھے ہوئے ایک بدزبان شخص نے چورِت کے بارے میں انتہائی نامناسب تبصرہ کیا۔ بیان کرنے کے قابل نہیں۔ ایک آدھ حرف اوپر نیچے کر کے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ترشنگ!......فطرت کا لازوال شاہ کار!

یہ گاؤں نانگا پربت کے بیس کیمپ کا بیس کیمپ ہے۔ ٹریک پر آنے والوں کے لیے ترشنگ میں ایک رات قیام ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہماری بدذوقی تھی کہ اسے پڑاؤ کی بجائے گذرگاہ سمجھا اور چند تصویریں بنا کر آگے نکل جانے کا پروگرام بنایا۔

ندیم حسین نے ہمیں ایک کریانہ سٹور کے اندر رکھے ہوئے بنچ پر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

ترشنگ کے رنگین جلوے ہماری بے رُخی کے باوجود منہ دکھائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

ہم نے کیمرے اُٹھائے اور ترشنگ کی جلوہ نمائی کو خراجِ تحسین پیش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

ہمارا خیال تھا کہ جیپ یہاں چند منٹ رُک کر سواریاں اُتارے گی اور آگے روانہ ہوجائے گی۔ اس لیے تصویریں بناتے ہوئے بھی جیپ کے آس پاس منڈلاتے رہے۔

استور کی طرح ترشنگ میں بھی سمے کا دھارا دھیرے دھیرے ہی بہتا ہے۔

ہم نے تصویریں بنانے کے بعد لاہور سے آنے والے ایک گروپ کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ لگائی۔ جیپ پھر بھی اُسی جگہ کھڑی رہی تو ہم قریب پہنچے اور صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

جیپ تقریباً خالی تھی۔ ڈرائیور اور ندیم حسین کہیں نظر نہ آئے۔ عقبی نشست پر دو تین خواتین تشریف فرما تھیں۔ کچھ دور کھڑے چند افراد شدید پریشانی کے عالم میں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

اُن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ڈرائیور کی نیت خراب ہورہی ہے۔ اُس کے خیال میں روپل جانے والی سواریوں کی تعداد توقع سے کم ہے، تیل کے پیسے بھی پورے نہیں ہوں گے۔ وہ خسارے کا سودا نہیں کرنا چاہتا اور روپل جانے سے کنّی کترا رہا ہے۔ فی الحال وہ ’’ضروری کام‘‘ کا بہانہ بنا کر اپنے گھر چلا گیا ہے۔ روپل جانے یا نہ جانے کا فیصلہ اُس کی واپسی پر ہوگا۔

ایک صاحب پورے یقین سے فرما رہے تھے کہ جیپ ڈرائیور سواریاں چھوڑ کر فرار ہوگیا ہے اب واپس نہیں آئے گا۔ اُن کا مشورہ تھا کہ اُس کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی بجائے پیدل سفر شروع کردیا جائے تاکہ رات ہونے سے پہلے روپل پہنچ سکیں۔

ہم ذہنی طور پر ٹریک کے لیے تیار تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا نہیں، ندیم حسین کا مسئلہ ہے۔ تذبذب کے وقفے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شام کی چائے پینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جیپ کے قریب ہی روپل ریزورٹ کا بورڈ نظر آیا۔ ہم صدر دروازے سے داخل ہوئے اور......حیران رہ گئے!

ترشنگ جیسے چھوٹے سے گاؤں میں اتنا خوب صورت اور جاذبِ نظر ریزورٹ کچھ اجنبی سا لگا۔ ریزورٹ کا سرسبز لان دل کشی کا مرقع تھا اور پھولوں کے تختے اس کی زیب وزینت بڑھا رہے تھے۔

لان میں رکھی میز کرسیوں کا رنگ بھی غالباً کسی مصوّر کے مشورے سے منتخب کیا گیا تھا۔

قاسمی صاحب چائے بھول کر نہایت انہماک سے ریزورٹ کی عکس بندی میں مصروف ہوگئے۔

لان اور کیمپ فائر کے لیے بنائے گئے دائرہ نما چبوترے کے چند شاٹ لینے کے بعد وہ مرکزی عمارت کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ ایک نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ بغیر اجازت عمارت کی عکس بندی پر اعتراض کرے گا، مگر اُس نے قریب آ کر قدرے جھکتے ہوئے سلام کیا اور حال چال پوچھا۔

تعارف پر علم ہوا کہ یہ خوش شکل، خوش لباس، خوش بیان اور خوش مزاج جوان روپل ریزورٹ کے مالک کا فرزندارجمند جہاں زیب ہے۔ ہمارے بارے میں چند سوالات کرنے کے بعد اُس نے چائے کی دعوت دی۔ ہم نے بتایا کہ ہم یہاں چائے پینے ہی آئے ہیں، مگر مفت کی نہیں۔ جہاں زیب کے اصرار پر ہم نے دعوت قبول کر لی۔ وہ ہمیں لان کے گوشے میں رکھی ہوئی الگ تھلگ میز پر لے آیا۔

تفصیلی تعارف پر علم ہوا کہ جہاں زیب کا روپل ریزورٹ کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

وہ قیمتی پتھروں کا کاروبار کرتا تھا۔ چند روز سے اُس کے والد صاحب گلگت گئے ہوئے تھے اس لیے ریزورٹ کے انتظامات اُسے سنبھالنے پڑ رہے تھے۔

وہ مجاہد قاسمی صاحب کی شخصیت میں انوکھی سی کشش محسوس کر کے ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

جہاں زیب کے ساتھ گپ شپ کے موضوعات میں لعل و گوہر، مقامی روایات اور بیس کیمپ ٹریک شامل تھے۔ انگریزی ادب میں اُس کے انتخاب نے مجھے حیران کیا۔

وہ ریان ہولیڈے کی ''ایگو اِز دی اینمی'' (EGO IS THE ENEMY) کا مطالعہ کر رہا تھا۔

یہ نفسیاتی موضوع سوشل میڈیا کے ڈسے ہوئے جوانوں کی نفسیات سے میل نہیں کھاتا۔

جہاں زیب کو علم ہوا کہ ہم روپل فیس بیس کیمپ کے لیے آئے ہیں تو اُس نے ہر طرح کی سہولیات انتہائی مناسب معاوضے پر فراہم کرنے کی پیش کش کی۔ ہم نے بتایا کہ ٹریک کے انتظامات ندیم حسین کے سپرد کیے جا چکے ہیں تو اُس نے ٹریک کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ٹریک سے واپسی پر روپل ریزورٹ میں گرم پانی سے شاور کا اعزازی وقفہ کرنے کی دعوت دی۔ اُس نے یہ پیشکش بھی کی کہ ترشنگ میں اگر رات کا قیام کرنا چاہیں تو روپل ریزورٹ کی انتظامیہ کمرے کے کرائے میں خصوصی رعایت دے گی۔ جہاں زیب چاہے وہاں ہو یا نہ ہو۔

یہ فراخدلانہ اور بن مانگی پیشکش سن کر مجھے قاسمی صاحب کی بے پایاں کشش پر رشک آیا۔

رشک محض دکھاوے کے لیے لکھ دیا ہے۔

سچ پوچھیں تو حسد محسوس ہوا اور استور کے جوانوں پر ترس آیا۔

پہلے نصرت دین اور اب جہاں زیب

مجاہد قاسمی صاحب کی روحانیت اسی طرح رنگ جماتی رہی تو خدشہ ہے کہ چند روزہ قیام کے دوران وہ جوانانِ استور کے مقبول ترین پیرومرشد بن جائیں گے۔

خیر!...... بن جائیں، ہمیں کیا۔ خود بھگتیں گے، دونوں۔

ترشنگ کا روپل ریزورٹ چند روزہ فیملی ٹور یا دوستوں کے ساتھ سفر کے لیے ایک پُرکشش منزل ہے۔ کمروں کا کرایہ دیگر ہوٹلوں کی نسبت کچھ زیادہ ہے، ڈبل بیڈ کے لیے آٹھ سے دس ہزار (اور اب شاید مہنگائی کے باعث بارہ سے پندرہ ہزار)...... مگر ریزورٹ کی بناوٹ، سجاوٹ، معیار اور سہولیات کے لحاظ سے یہ کرایہ اتنا زیادہ بھی نہیں۔

جہاں زیب کی پیشکش تقریباً ایک گھنٹے بعد تشریف لائی، مگر آتے آتے پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بنائے گئے قہوے میں تبدیل ہو گئی۔ جہاں زیب نے جواب طلب نظروں سے قہوہ لانے والے کی طرف دیکھا۔ اُس نے جواب دیا کہ روپل ریزورٹ میں ڈبّے کا دودھ استعمال نہیں کیا جاتا اور اس وقت تازہ دودھ دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے مقامی قہوے پر گزارا کرنا پڑے گا۔

قہوہ پیش کرنے کا انداز مگر اتنا دیدہ زیب تھا کہ چسکی لگانے سے پہلے سواد آ گیا۔

قہوے کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔

قہوہ کتنا ہی فرحت بخش اور نفیس کیوں نہ ہو۔ قہوہ قہوہ ہوتا ہے اور چائے چائے ہوتی ہے۔

چائے کی طلب ریزورٹ سے باہر انتہائی غیر نفیس کھوکھے نے پوری کی۔

جیپ کا ہارن کئی بار بجایا گیا تو اندازہ ہوا کہ روپل جانے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ پانچ چھ سواریاں جیپ میں بیٹھ چکی تھیں اور ڈرائیور غالباً ہمیں ہی بلانے کے لیے ہارن پہ ہارن بجائے جا رہا تھا۔

ہمارے سوار ہوتے ہی جیپ روانہ ہو گئی۔

چلتے چلتے...... ''بارے ترشنگ کا کچھ بیاں ہو جائے''

پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر لکھے گئے سفرنامے پڑھنے والے قارئین ترشنگ گاؤں کے حسن و جمال سے بخوبی واقف ہیں۔ اس بستی کی شان میں بہت سے لوگ اپنے اپنے انداز میں افسانے اور غزلیں لکھ چکے ہیں۔ اس لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ ترشنگ فطرت کے دستِ خاص سے ٹانکا گیا وہ موتی ہے جس کی آب و تاب لازوال اور بے مثال ہے۔

یہ بستی رائے کوٹ پیک کے دامن میں آباد ہے اور اس پیک کی دوسری طرف پریوں کا دیس

فیری میڈوز ہے۔ اس نسبت سے ترشنگ فیری میڈوز کی پڑوسن کہی جا سکتی ہے۔ مگر یہ پڑوسن فیری میڈوز کی طرح دل پھینک نہیں ہے۔ ہرایرے غیرے کو اپنی جلوہ گاہ میں طلب نہیں کرتی۔

حسن کی شمع کے ادب وآداب سے واقف پروانوں ہی کو طواف کی اجازت دیتی ہے۔

یہ ہو گیا نثری قصیدہ، اب غزل رنگ بھی سن لیجیے:

ترشنگ کے سب نظارے دل کش بہت ہیں پیارے
جس میں ہو ذوقِ فطرت یک شب یہاں گزارے

قہوہ اور کڑک چائے پی کر چلتا نہ بنے

ترشنگ کو الوداع کہتے ہی روپل کا انتظار شروع ہو گیا۔

میں نے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مقامی شخص سے دریافت کیا کہ روپل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ اُس نے انکشاف کیا کہ جیپ روپل نہیں، پلّے روپل جا رہی ہے۔ روپل جانے والوں کو ڈیڑھ دو کلومیٹر پیدل چلنا پڑے گا۔ پلّے روپل؟...... کیا ہے یہ پلّے روپل؟ ابھی دیکھتے ہیں۔

ترشنگ کا الوداعی منظر ایک سرسبز و شاداب اور گل و گلزار میدان ہے۔

اسے روپل جیپ ٹریک کا خوش آمدیدی پیغام بھی کہا جا سکتا ہے۔

چند سال پہلے جیپ ٹریک نہیں بنا تھا تو نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک اسی سبزہ زار سے شروع ہوتا تھا۔ چار کلومیٹر فاصلے پر واقع روپل گاؤں چائے پانی کے لیے وقفہ سمجھا جاتا تھا۔

جیپ ٹریک بننے کے بعد لاتوبو بیس کیمپ ٹریک کا پیدل فاصلہ چار کلومیٹر کم ہو گیا ہے۔

ترشنگ سے روپل تک بنایا گیا پرانا جیپ ٹریک ترشنگ گلیشیر کے پتھروں پر سے گزرتا تھا اور اکثر و بیشتر لینڈ سلائیڈنگ یا برف باری کی زد میں آ کر بند ہو جاتا تھا۔

چند سال قبل ترشنگ نالے پر پل تعمیر کر کے گلیشیر کی رکاوٹ دور کر دی گئی ہے اور اب ایک نیا راستہ بن گیا ہے جس کی چکر پھیریاں روپل گاؤں کو پہلے کی نسبت تین کلومیٹر دور لے گئی ہیں۔

نیا جیپ ٹریک چار کی بجائے سات کلومیٹر فاصلہ طے کر کے روپل پہنچتا ہے۔

ہمارے قریب بیٹھا ہوا مقامی شخص اس بات پر سخت پریشان تھا کہ جیپ صرف پلّے روپل تک جا رہی ہے اور اُسے بیوی بچوں سمیت ڈیڑھ دو کلومیٹر سفر پیدل طے کرنا پڑے گا۔

میں اُس کی پریشانی پر حیران و پریشان تھا۔

وہ اس علاقے کا باشندہ ہو کر ڈیڑھ دو کلومیٹر پیدل چلنے سے گھبرا رہا ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟

اُس نے وضاحت کر کے پریشانی دور کر دی:

''میں بیس برس پہلے کراچی چلا گیا تھا۔ میرے بچے پہاڑی راستوں پر چلنے کی عادت نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس تین بھاری بیگ بھی ہیں۔ اکیلا ہوتا تو دس منٹ میں روپل پہنچ جاتا۔''

روپل نامی قدیم بستی روپل بالا یا اپّر روپل کہلاتی ہے۔

راستے میں آنے والی آبادی کو پلّے روپل، روپل پائیں یا لوئر روپل کا نام دیا گیا ہے۔

سورج نانگا پربت کی اوٹ میں چلا گیا تھا اور شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

جیپ سے باہر تاک جھانک کا فائدہ نہیں ہوا۔ راستے کے مناظر اور برف پوش بلندیاں چپ چاپ گزر گئیں۔ ہم آدھے گھنٹے بعد پلّے روپل پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے اعلان کیا:

''یہ آخری سٹاپ ہے۔ سب سواریاں اتر جائیں۔''

ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے مقامی شخص نے تین سواریوں کا کرایہ پندرہ سو روپے ادا کیا۔

استور سے ترشنگ تک تیس کلومیٹر فاصلے کا کرایہ تین سو روپے فی سواری ہے۔

ترشنگ سے پلّے روپل تک چار کلومیٹر کے لیے دو سو روپے وصول کیے جا رہے تھے۔ یہ فرق جیپ ٹریک کی چڑھائی اور سنگ زاری کی عکّاسی کرتا ہے۔ میں نے ایک ہزار کا نوٹ ندیم حسین کو دینا چاہا کہ وہ اپنے کرائے کے ساتھ جیپ ڈرائیور کو ادا کر دے۔ اُس نے اعتراض کیا:

''آپ لوگوں کا کرایہ دو ہزار بنتا ہے۔''

''وہ کیسے؟ ان صاحب نے تین سواریوں کا کرایہ پندرہ سو روپے ادا کیا ہے۔ دو لوگوں کا کرایہ دو ہزار کیسے بن گیا۔'' میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''ہمیں حساب کتاب کا پتا نہیں ہے۔ ڈرائیور انکل نے ترشنگ میں بول دیا تھا کہ آپ لوگوں سے دو ہزار لینے ہیں۔'' ندیم حسین نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''ڈرائیور انکل نے ترشنگ میں کیوں بولا تھا۔ اب کیوں نہیں بول رہے؟''

'ڈرائیور انکل ترشنگ ہی میں بیٹھا ہے۔ اِدھر گاڑی اُن کا بیٹا لایا ہے۔''

''اپنے انکل کے بیٹے کو بتا دو کہ ہم اِتنا ہی کرایہ دیں گے جتنا دوسرے مسافر دے رہے ہیں۔''

''آپ بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ جیپ روپل نہیں جاتا۔ ترشنگ میں رُک جاتا ہے۔ ترشنگ

سے آگے گاڑی صرف ٹورسٹ لوگوں کو لاتا ہے۔اس لیے اُن کا کرایہ زیادہ ہے۔''

''ٹورسٹ لوگ بھی محنت کر کے پیسے کماتے ہیں، درختوں سے توڑ کر نہیں لاتے۔ یہ گاڑی اگر ٹورسٹ کے لیے آئی ہے تو اس میں مقامی لوگ کیوں بیٹھے ہیں؟ اور یہ روپل تک کیوں نہیں جا رہی؟ ہمیں جیپ کے آخری سٹاپ تک پہنچا دیں، ہم دگنا نہیں......تین گنا کرایہ ادا کریں گے۔''

میرے لہجے میں تلخی آ گئی......اور تلخی پیدا ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔

ہم بلتستان کی سیّاح دوست پالیسی کے عادی تھے اور اتنے ''دوستانہ سلوک'' کا مظاہرہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔اس رویّے کے لیے مری اور ناران بدنام ہیں۔مگر وہاں بھی ٹورسٹ اور مقامی سواری کے کرائے میں فرق نہیں رکھا جاتا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اعلیٰ عدلیہ کے انصاف کا ترازو اتنی جلدی ترشنگ اور پلّے روپل جیسے دشوار گذار علاقوں تک پہنچ گیا ہے۔

بے تکی دلیلیں سن سن کر میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے حتمی لہجے میں کہا:

''ہم کسی صورت زیادہ کرایہ نہیں دیں گے، آپ زبردستی لینا چاہتے ہیں تو چھین لیں۔''

ڈرائیور انکل کا بیٹا جو حیرت انگیز طور پر کرائے کی بحث سے لاتعلق رہا تھا، صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر میرے قریب آیا اور زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر فرمایا:

''انکل جی ناراض کیوں ہوتے ہو؟ آپ ہمارے مہمان ہو۔ چلو ایک ہزار دے دو۔''

''لیکن ڈرائیور انکل نے کہا تھا اِن سے دو ہزار لینے ہیں۔'' ندیم حسین نے احتجاج کیا۔

ڈرائیور انکل کے بیٹے نے احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی۔ایک ہزار کا نوٹ پکڑا اور واپس چل دیا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اصل ''نظام الملک'' نہیں، اُس کا ناتجربہ کار بیٹا ہے۔

اصل ہوتا تو پوری وادی کی سیّاحت کو داؤ پر لگا دیتا، اپنی اکڑی ہوئی گردن سے سریا نہ نکالتا۔

ندیم حسین کے رویّے نے دل میں کھٹک پیدا کر دی۔ وہ ہمارا گائیڈ تھا۔اُسے ڈرائیور انکل سے زیادہ ہمارے مفاد کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر وہ دگنا کرایہ وصول کرنے پر بضد تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ روپل پہنچ کر ندیم حسین کے ساتھ طے ہونے والے معاملات پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔ندیم حسین نے یہ بتا کر فیصلے پر پانی پھیر دیا کہ اُس کا گھر پلّے روپل میں ہے اور رات کا قیام یہیں ہوگا۔اس بستی میں کیونکہ قیام و طعام کی کوئی اور سہولت دستیاب نہیں تھی، اُسے پورٹر یا گائیڈ بنائے رکھنا مجبوری بن گیا۔

اُس نے ہمیں چند منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک گلی کی طرف چلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ ٹریک کا آغاز روپل کی بجائے پلّے روپل سے ہوگا تو عبدالرؤف کی باتوں پر بھی شک ہونے لگا۔اُس نے کہا تھا کہ ندیم حسین روپل میں رہتا ہے اور پیدل سفر وہیں سے شروع ہوگا۔اب صورتِ حال یہ تھی کہ پہلے دن کے ٹریک میں تقریباً چار کلومیٹر اضافہ ہو گیا تھا۔

روپل کے ساتھ جڑا ہوا، اپّر خبردار کر رہا تھا کہ مسئلہ صرف فاصلے کا نہیں، چڑھائی کا بھی ہے۔

عبدالرؤف نے جیپ منصوبے کے مقابلے پر پانچ ہزار روپے کی بچت کے سہانے خواب دکھا کر یہ نیا پروگرام بنایا تھا، مگر اب وہ خواب ڈراؤنے لگنے لگے۔

پہلے دن لاتوبو پہنچ سکیں گے؟......درمیان میں پڑاؤ کرنا پڑے گا؟......یا واپسی؟

میں انھی فرضی خدشات میں ڈوبا ہوا تھا اور قاسمی صاحب حسبِ معمول سب فکروں سے بے نیاز، منظر نامے کی رنگینیاں سمیٹنے میں مگن تھے۔پلّے روپل نسبتاً کشادہ وادی ہے۔اس لیے رات کی تاریکی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔بلیو آور (BLUE HOUR) کی رنگینیاں ابھی باقی تھیں۔

فوٹوگرافی کی اصطلاح میں سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب کے تقریباً تیس منٹ بعد تک کا وقت ''بلیو آور'' کہلاتا ہے۔ وہ لمحے جن میں روشنی کی نرمی اور رنگوں کی لطافت افق پر ماورائی رنگ بکھیر دیتی ہے۔لینڈ سکیپ کی فوٹوگرافی کے لیے اسے ڈرامائی وقت سمجھا جاتا ہے۔

قاسمی صاحب ڈراما عکس بند کر رہے تھے اور میں ڈراؤنے خواب دیکھ رہا تھا۔اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی تھی؟ تلافی کے لیے ابھی چند منٹ باقی تھے۔میں نے بیگ میں سے کیمرا نکال لیا۔

پلّے روپل کی پہلی تصویر نے اپنے رنگوں کے سحر میں گرفتار کر لیا۔

بلیو آور کے باقی لمحات بے خودی میں گزر گئے۔جس طرح ایک تصویر سینکڑوں الفاظ پر بھاری ہوتی ہے، اسی طرح ایک شعر ہزاروں تاثرات پر بھاری پڑتا ہے۔

وقت ہے اب آ کر دیکھو اس بستی کی شام
پلّے روپل میں کیا ہے رنگوں نے بسرام

بدگمانیاں رنگوں کے بسرام میں گُم ہو گئیں اور خدشات کا بھوت سر سے اتر گیا۔

ندیم حسین تقریباً چالیس منٹ بعد نمودار ہوا اور ہمیں ایک تنگ گلی سے گزارتا ہوا اپنے گھر کے مہمان خانے تک لے گیا۔مقامی ثقافت سے آراستہ فرشی قالینوں پر کڑھائی دار تکیے لگے ہوئے تھے۔

ہم نے سامان ایک کونے میں رکھا اور تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

ندیم حسین کھانے کا بندوبست کرنے کی نوید سنا کر باہر چلا گیا۔

ہم نے سفر کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے ملحقہ واش روم کے قلفی جماؤ پانی سے غسل کیا اور کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹریک کا آغاز صبح سویرے ہونا تھا اس لیے ہم چاہتے تھے کہ جلدی سو جائیں۔

کھانا مگر آتے آتے تین گھنٹے چٹ کر گیا۔

دیر آید درست آید۔ کھانا سادہ مگر لذیذ تھا۔ گھر کے لان میں اگایا گیا چرتر اور قلفے کا ساگ، ہری مرچ کی چٹنی، مکھن اور تازہ چپاتیاں۔ کھانے کے بعد قہوہ اور پھر شدید غنودگی کا حملہ۔

ندیم حسین نے فرشی قالین پر میٹریس اور کمبل بچھا دیے تھے۔ نیند نے فوراً آغوش میں لے لیا۔ قاسمی صاحب کا پتا نہیں، میں ساری رات بیس کیمپ کے سپنے دیکھتا رہا...... کبھی خوشی...... کبھی غم

رات گئی بات گئی۔

صبح سویرے ندیم حسین نے کمرے میں داخل ہو کر روشنی کی تو آنکھ کھل گئی۔ یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی۔ مگر جب اُس نے بتایا کہ فجر کی اذان ہو چکی ہے اور وہ وضو کے لیے گرم پانی کی بالٹی رکھنے آیا ہے تو ناگواری کی جگہ شکر گزاری نے لے لی۔

نماز کے بعد مجاہد قاسمی صاحب کمرے سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

وہ شاید چڑیا کی نیند سوتے ہیں۔ تین چار گھنٹے آنکھیں بند کیں اور نیند پوری کر لی۔ مجھے نماز کے دوران بھی نیند کے جھونکے ستاتے رہے۔ قاسمی صاحب کی پوری کوشش کے باوجود میں اپنے مزاج میں فوٹوگرافی کے اتنے طاقتور جراثیم پیدا نہیں کر سکا جو نیند قربان کرنے پر مجبور کر دیں۔

سحر خیزی کی برکات پر اُن کا وعظ سنتے ہوئے کان بند کیے اور سر کمبل میں چھپا لیا۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے...... ہم اپنی کملی کیوں چھوڑیں؟

دن چڑھے آنکھ کھلی تو قاسمی صاحب کیمرے کے بیگ میں کوئی لینز یا فلٹر تلاش کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں ملتے دیکھ کر فرمایا:

''ڈاکٹر جی بستر سے نکل آئیں۔ باہر زبردست آفت آئی ہوئی ہے۔''

''کیسی آفت؟'' میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

''بتانے والی نہیں، دیکھنے والی ہے۔ اسے کھو کر بہت پچھتائیں گے۔''

میں نے اُن کے مشورے پر عمل کیا اور گھر کے پہلو میں پھیلے ہوئے سبزہ زار پر اُترتی ہوئی آفت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ واقعی دم بخود کر دینے والا (BREATHTAKING-VIEW) منظر تھا۔

قاسمی صاحب کیمرے کے استعمال میں بے حد محتاط ہیں، مگر الفاظ کے استعمال میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ کمرے سے باہر آفت نہیں، قیامت تھی...... احمد فراز کی قیامتِ جاناں:

سب قیامت قامتوں کو دیکھ لو
کیا پلے روپل کا ثانی اور ہے؟

میں نے فطرت نوردی کے تیس برسوں میں کم از کم چار مرتبہ قیامت جاناں کو اترتے دیکھا ہے۔

وہ یادگار صبح جب کریم آباد کے ہوٹل کی چھت سے نگر کی چھیل چھبیلی راکاپوشی کا دیدار ہوا۔

دوسری لازوال صبح نانگا پربت کے چرنوں میں اُتری تھی۔ فیری میڈوز کے ایک کاٹیج میں۔

تیسری مترے پیک کے دامن میں نقاب رُخ الٹ کر سامنے آئی...... سامنے کے۔ٹو تھا۔

اور چوتھی ایک بار پھر نانگا پربت کے چرنوں میں اتری ...... آفت اور قیامتِ جاناں۔

پلّے روپل کی شاداب ہریالی اور نکھر آئی تھی۔ پھولوں کے رنگ کچھ اور شوخ ہو گئے تھے۔

لگتا تھا کہ فطرت کی دیوی خصوصی ہار سنگھار کر کے درشن جھروکے میں جلوہ افروز ہوئی ہے۔

پروانوں کے پر جلاتی ہے اور اپنی شمعِ حسن پر خود ہی نثار ہوئی جاتی ہے۔

مجاہد قاسمی صاحب نے بجا فرمایا تھا۔ میں اگر قیامت جاناں کا طلسم ہوش رُبا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو فیس بک پر اپ لوڈ ہونے والی تصویریں دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا اور قاسمی صاحب کی جان کھائے رکھتا۔

''مجھے کیوں نہیں نکالا؟''

فطرت کی پوشیدہ رعنائیاں صرف دل کی آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

کوئی تصویر یا تحریر ان کی مکمل عکاسی نہیں کر سکتی۔

پلّے روپل میں اتری ہوئی آفت ابھی تک جاری تھی مگر وقت بے رحمی سے گزر رہا تھا۔

میں نے کئی بار قاسمی صاحب سے درخواست کی کہ اب واپس چلنا چاہیے تا کہ ٹریک وقت پر شروع ہو سکے اور ہم اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ ٹریک کے لیے اسی راستے سے گزرنا ہوگا، یہ تصاویر اُس وقت بنا لی جائیں گی۔

قاسمی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا:

''منزل پر بروقت پہنچنا ٹریکر کے جذبے اور ہمت پر منحصر ہے،لیکن گولڈن آور نکل گیا تو کسی قیمت پر دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔اس وقت کی سنہری روشنی فطرت کی خصوصی عنایت ہے۔ایسی عنایات گارنٹی شدہ نہیں ہوتیں،فطرت جب چاہے واپس لے لے۔''

اب تک کے سفر میں قارئین جان چکے ہوں گے کہ قاسمی صاحب کو گنگنانے کا موقع مل جائے تو خود پر قابو نہیں رہتا۔اس وقت خوب موقع تھا:

سنہری روشنی......بھیگی گھاس......رنگِ بہار...... ہرطرف گل زار......اور بادِصبا

اُن کی دھیمی دھیمی آواز بادِصبا کے ساتھ گھل مل گئی۔

ملتی ہے زندگی میں یہ دولت کبھی کبھی
ہوتی ہے روشنی کی عنایت کبھی کبھی
کھلتے نہیں ہیں روز دریچے بہار کے
آتی ہے جان من یہ قیامت کبھی کبھی

اس میں شک نہیں کہ قاسمی صاحب کی بے ساختہ گنگناہٹ صورتِ حال کے عین مطابق تھی۔ پلّے روپل میں رنگیں بہاروں کے سب دریچے کھلے ہوئے تھے۔فطرت کی انمول دولت بے مول لٹائی جارہی تھی اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ناشتے کے بعد بھی یہ فیاضی جاری رہے گی۔

قاسمی صاحب کا دل ابھی بھرا نہیں تھا،مگر ایک لڑکے نے ندیم حسین کا پیغام پہنچایا:

''ناشتا سات بجے سے پہلے لگا دیا گیا تھا،جلد از جلد دسترخوان پر پہنچ جائیں۔''

ہم نے ناشتے کے لیے ساڑھے چھ بجے اور ٹریک شروع کرنے کے لیے سات بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔اب سوا سات بج چکے تھے اور قاسمی صاحب روشنی کی عنایت کا پیچھا کر رہے تھے۔

وہ بادلِ ناخواستہ واپس ہوئے،مگر واپسی کے مختصر سے سفر میں بھی جگہ جگہ رک کر فطرت کے رنگ کیمرابند کرنے کا موقع ڈھونڈتے رہے۔

ناشتا پہاڑی زندگی کی فطری سادگی کا مظہر تھا:

پراٹھا،مکھن،جام،چٹنی،نمک،چائے......اور شہد

سادہ مگر سیر کرنے والا......بیس کیمپ ٹریک کے لیے طاقت کا خزانہ

روپل جو ایک گاؤں ہے عالم میں انتخاب

دارا شکوہ کی گردن......جین میں پھنسی ہوئی پھلجھڑی...... ہرلی کوفر بیس کیمپ

ناشتے کے بعد ٹریک شروع ہوا۔ندیم حسین نے بتایا کہ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ہم ٹریک شروع کریں وہ سامان گدھے پر بار کر کے آئے گا اور ہمارے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

ہم نے کیمرا بیگ اٹھائے اور اُسی راستے پر چل دیے جس پر چند منٹ پہلے فوٹو گرافی کرتے رہے تھے۔گاؤں کے آخری کونے پر نظر آنے والی کھوکھا نما دکان سے جوس نمکو اور بسکٹ کے پیکٹ خریدے۔پلّے روپل میں بنیادی ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں،معیار بس گزارا ہے۔

ٹریک پر ہوں تو چلتا پھرتا لنچ عموماً گزارے پر ہی چلتا ہے۔

پلّے روپل سے نکلتے ہی ایک ثقافتی منظر نے استقبال کیا۔راستے کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں اور اُن کے بیچ سے گزرتا ہوا چھوٹا سا ریوڑ۔سورج کی ترچھی روشنی میں بھیڑ بکریوں کی اون کے چمکتے ہوئے ریشے اور درختوں کے سائے بہترین تصویر کا موضوع بن رہے تھے۔

قاسمی صاحب نے ٹریک شروع کرنے کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ریوڑ آتا دیکھ کر اُٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرائے اور کیمرا اوپر اٹھا لیا۔فرشتے کہیں مائنڈ ہی نہ کر گئے ہوں؟

پلّے روپل سے آگے وادی پھیلتی جاتی ہے۔منظر میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آتی۔

راستے کا پہلا توجہ طلب منظر ایک جھریوں بھرے چہرے کی صورت میں سامنے آیا۔

وہ صاحب تیز دھار والا جمبو سائز کلہاڑا کندھے پر رکھے سگریٹ نوشی فرما رہے تھے۔ٹریک پر لینڈ سکیپ تو بہت ملتے ہیں،پورٹریٹ کبھی کبھی نظر آتی ہے۔وہ صاحب بنی بنائی پورٹریٹ تھے۔

قاسمی صاحب اُنھیں چھوڑ کر آگے کیسے جاسکتے تھے؟ کلہاڑے کے مقابلے پر کیمرا تان لیا۔

پورٹریٹ صاحب نے شدید ناگواری ظاہر کرتے ہوئے تصویر بنانے سے روک دیا۔قاسمی صاحب کی باقاعدہ منت سماجت پر بھی وہ راضی نہ ہوئے۔خواتین کا تصویری پرہیز عموماً مقامی ثقافت، یا شرعی پردے کی پابندی ظاہر کرتا ہے۔ہم سے زیادہ جھریوں بھرے چہرے کو کیا مسئلہ تھا؟ مذہب؟ خودنمائی؟ یا ضعیف الاعتقادی؟

ہمارے پاس بزرگ کی تحلیلِ نفسی کا وقت نہیں تھا۔اُن کی بجائے کلہاڑے کو ماڈل بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے قاسمی صاحب کومکھن لگایا کہ اگرکلہاڑے کی ماڈلنگ میں وہ بھی شامل ہوجائیں تو اُن کے مغلیہ خط وخال تصویر کو چار چاند لگادیں گے۔قاسمی صاحب عموماً مکھن پروف ثابت ہوتے ہیں۔اس وقت جھانسے میں آکر چاند چڑھانے پر آمادہ ہوگئے۔ان کے سائیڈ پوز میں تھوڑی سی مبالغہ آمیزی کے ساتھ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی شباہت دریافت کی جاسکتی ہے۔

اس دریافت کے بعد قاسمی صاحب کی کلہاڑ ابردار تصویر،صرف تصویر نہیں رہتی،مغلیہ تاریخ کا آئینہ بن جاتی ہے۔لگتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر''نافرمان والد'' کی شاہ جہانی پر قبضہ جمانے کے لیے اپنے بڑے بھائی اورمغلیہ سلطنت کے اصل ولی عہد داراشکوہ کی گردن تلاش کررہا ہے۔

بچ کے رہنارے''دارا'' بچ کے رہنارے!

داراشکوہ فوٹوسیشن کے پانچ منٹ اور پلّے روپل سے روانہ ہونے کے تقریباً چالیس منٹ بعد اپّر روپل (روپل بالا) کی پہلی جھلک نظر آئی۔

وسیع وعریض اورسرسبز وشاداب وادی میں لکڑی سے بنائے گئے روایتی مکانات کی قطار، بیشتر کی چھت لکڑی ہی کی تھی،چندایک پرجستی چادر بھی نظر آئی۔رنگین چھتوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ہم روپل بالا میں پلّے روپل سے زیادہ رنگ برنگے منظر نامے کی توقع رکھتے تھے۔

روپل پر ہر طرف صرف ہریاول چھائی ہوئی تھی۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روپل میں فطرت کے حسن وجمال کی کمی تھی۔

اپنے دورِ فلم''نوشی'' کے مطابق پلّے روپل کے لیے پروین بوبی اورروپل بالا کے لیے مدھو بالا کی مثال ذہن میں آرہی ہے۔ٹھیک ہے؟

روپل بالا کے منظر نامے میں فطرت کی سادگی کے ساتھ زندگی کی گہما گہمی کا بھی دخل تھا۔ پلّے روپل میں سکوت کا عالم طاری تھا۔سکول جاتے ہوئے چند بچے اوربکریوں کا ایک آدھ ریوڑ زندگی کا احساس دلا رہے تھے۔روپل میں روزمرّہ زندگی کی مصروفیات عروج پر تھیں۔

کھیتوں میں زیادہ تر خواتین اورایک آدھ حضرت شانہ بہ شانہ کام کررہے تھے۔

اُن کے پسینے سے تر چہرے ذہنی تناؤ کی کیفیت سے پاک تھے۔ہم زندگی کی آب وتاب کے لیے بیوٹی شاپ کے محتاج تھے،اتنی''اصیل'' شادابی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

قاسمی صاحب نے کھیتوں میں کام کرنے والے ایک صاحب سے انٹرویو لیا۔اُن کا خاندان چورت میں آباد تھا۔روپل میں وہ موسمِ گرما''کمانے'' آتے تھے اور برف باری شروع ہوتے ہی واپس چلے جاتے تھے۔اُن کی غذائی ضروریات گلّہ بانی اورکھیتی باڑی سے پوری ہوجاتی تھیں۔

آلو،مٹر،شلجم،مکئی اورگندم وہ کاشت کرتے تھے۔عوامی خوراک ساگ خودبخود اُگ آتا تھا۔

دودھ، دہی، پنیر،مکھن،گوشت اور انڈے پالتو مویشیوں اور مرغیوں سے حاصل ہوجاتے تھے۔دوسری ضروریات کے لیے خاندان کا سربراہ سال میں ایک آدھ چکر استور کا لگا لیتا تھا۔

ان علاقوں میں رہنے والے صحت کی ناکافی سہولیات کا شکوہ ضرور کرتے ہیں۔وہ صاحب اس بارے میں بھی مطمئن تھے۔روپل میں الٹرا ساؤنڈ،لیب اورایکسرے وغیرہ کی سہولت میسّر نہیں تھی اس لیے وہ شوگر اورکولیسٹرول وغیرہ کی فکر سے آزاد تھے۔انھیں علم نہیں تھا کہ بچے کی پیدائش کے لیے چھوٹے یا بڑے آپریشن کی ضرورت پڑسکتی ہے۔اُن کی خواتین کھیت میں کام کرتے ہوئے بچے کو جنم دینے کی عادی تھیں۔ایک آدھ جان لیوا حادثے کو اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کرلیا جاتا تھا۔

روپل کے باشندوں کی بے نیازی اور قناعت پسندی غالباً فطرت کی خصوصی عنایت کا نتیجہ تھی۔وہ اپنے مقاصد کی نگہبانی کرنے والوں پر چشمِ عنایت رکھتی ہے اورسرکاری پرچی کے لیے طویل قطار میں لگانا پسند نہیں کرتی۔

اُن سے دریافت کیے گئے حال احوال کا لب لباب کچھ یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

کیا بودو باش پوچھو ہو ''نیچے'' کے باسیو
فطرت کے شاہکار کو پسماندہ جان کے
روپل جو ایک گاؤں ہے عالم میں انتخاب
آتے ہیں منتخب ہی یاں فطرت نگار کے
اس کو ملے وہ رنگ کہ گل زار بن گیا
ہم رہنے والے ہیں اسی رشک جہان کے

پربتوں کی گود میں پلنے والے روپل کے رشکِ جہان ہونے میں آخر کسے شک ہوسکتا ہے؟ دنیا میں روپل کے علاوہ شاید ہی کوئی اوربستی ہو جہاں کے باشندے اپنے مہمانوں کوصرف بیس پچیس منٹ اور ہم جیسے بزرگوں کو ڈیڑھ سے دو گھنٹے واک کرکے آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند

چوٹی نانگا پربت کی زیارت کروادیتے ہوں۔ ۷۰۷۰ میٹر بلند رائے کوٹ اور ۶۸۳۰ میٹر بلند چونگڑہ پیک ترشنگ ہی سے ساتھ نبھاتی آتی ہیں، جب ذرا گردن اٹھائی دیکھ لیں۔

روپل سے لاتوبو بیس کیمپ جانے کے لیے دو راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

جیپ ٹریک دائیں جانب والے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو ہرلی کوفر بیس کیمپ اور بازن گلیشیر پر سے گزرتا ہوا ٹاپ میڈوز (TAP-MEADOWS) تک جاتا ہے۔

بائیں جانب والا راستہ روپل گاؤں سے گزرتا ہے۔ پھر دریائے روپل عبور کرنے کے بعد شوگور پڑاؤ اور روپل گلیشیر پر سے ہوتا ہوا ٹاپ میڈوز پہنچتا ہے۔ یہ راستہ متروک ہوچکا ہے کیونکہ اس کے شروع میں ایک بلند و بالا اور دشوار گذار پہاڑی درّے سے واسطہ پڑتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہرلی کوفر بیس کیمپ راستے میں نہیں آتا جو ایک خوب صورت تاریخی پڑاؤ ہے۔ ٹاپ میڈوز پر یہ دونوں راستے مل جاتے ہیں اور نانگا پربت روپل فیس کے لاتوبو بیس کیمپ تک پہنچتے ہیں۔

روپل سے آگے لینڈ سکیپ میں واضح اور دلکش تبدیلی آئی۔ بازن گلیشیر کی اختتامی مورین نظر آنے لگی اور راستے کے دونوں جانب جنگلی گلاب کی جھاڑیاں گل پاشی کرنے لگیں۔

جوں جوں چڑھائی میں اضافہ ہوتا گیا، گل پاشیاں بڑھتی گئیں۔

روپل سے روانہ ہونے کے تقریباً پینتالیس منٹ بعد ہم پہلے خیمہ ہوٹل پر پہنچے۔

ندیم حسین ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہم ہوٹل کے لان میں کرسیوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

خیمہ ہوٹل کے منتظم کے ساتھ ہونے والی گپ شپ کے دوران علم ہوا کہ عبدالرؤف نے جیپ پروگرام ہمارے فائدے سے زیادہ ندیم حسین کے مالی مفاد کی خاطر تبدیل کیا تھا۔

ندیم حسین عبدالرؤف کا سگا بھتیجا تھا۔ عبدالرؤف کی بہن، یعنی ندیم حسین کی پھوپی لاتوبو گاؤں میں رہتی تھی۔ ندیم حسین اُسے راشن پہنچانے کے لیے ہفتے دو ہفتے بعد لاتوبو جاتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ اُنھیں راشن پہنچانے کے لیے لاتوبو جارہا تھا۔ گائیڈ کے طور پر اُس کا معاوضہ مفت کی آمدنی تھی۔ ندیم حسین اگر گائیڈ اور پورٹر کے فرائض اچھے طریقے سے پورے کردیتا تو ہمیں اس حسنِ انتظام یا حسنِ اتفاق پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟

ندیم حسین کے آتے ہی سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ پلّے روپل سے روانہ ہونے کے تقریباً دو گھنٹے اور اپّر روپل سے روانہ ہونے کے سوا ایک گھنٹے بعد ہم جیپ ٹریک کے اختتام تک پہنچ گئے۔

اپّر روپل سے سٹاپ کا فاصلہ کم و بیش تین کلومیٹر ہے اور یہاں چھوٹی سی خیمہ بستی آباد ہے۔

یہ بستی ایک خوب صورت پکنک پوائنٹ ہے جہاں قیام و طعام کی سہولت بھی دستیاب ہے۔

ترشنگ سے یہاں تک بذریعہ جیپ یا بائیک تقریباً ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا سفر ہے۔

وی لاگرز اور بائیکر کے لیے یہ چھوٹی سی بستی بہت بڑی سہولت ہے۔ اس جگہ بائیک پارک کرنے کے بعد ایک گھنٹا پیدل ٹریک، نانگا پربت کے پہلے بیس کیمپ پر چائے اور گرما گرم پکوڑے، نانگا پربت کی ویڈیو گرافی؛ اور وی۔لاگ مکمل کرنے کی خوشی میں پریشر ہارن بجاتے ہوئے رات ہونے سے پہلے واپس استور۔ تھوڑی سی ہمت کرکے اُسی روز چلم چوکی۔ دیوسائی۔ یامنی مرگ

روپل روڈ تیرا شکریہ۔ ہم کہاں کہاں سے گزر گئے۔ اور اتنی آسانی سے

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ترشنگ سے جیپ سٹاپ تک صرف فور بائی فور گاڑی جاسکتی ہے۔

زندہ دلانِ فطرت یہاں مہران، وٹز اور سوزوکی ڈبّا بھی چڑھا لائے تھے۔

جیپ سٹاپ سے آگے پیدل ٹریک ایک مختصر سی چڑھائی سے شروع ہوتا ہے۔ چڑھائی اگرچہ بہت مشکل نہیں، مگر اتنی شریف بھی نہیں کہ اسے معمول کی چہل قدمی سمجھ کر نظر انداز کردیا جائے۔

مجھے ڈیڑھ سال پہلے انجیو پلاسٹی کے مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں عام طور پر مشورہ دیا جاتا ہے کہ بلندی پر جانے سے پہلے دل کا معائنہ کروایا جائے اور معالج کی اجازت کے بغیر پہاڑوں کا سفر نہ کیا جائے۔ مجھے اپنا معائنہ کروائے چھ ماہ سے زیادہ ہوچکے تھے اور ورزش کا معمول بھی ترک ہوچکا تھا۔ ننھی منّی چڑھائی کو دل کے ایکسرسائز ٹالرنس ٹیسٹ (ETT) کا متبادل سمجھتے ہوئے میں نے اِس پر قدم رکھنے سے پہلے نبض ٹٹول کر دل کی دھڑکنیں شمار کیں۔

قاسمی صاحب کہاں چوکنے والے تھے۔ انھوں نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''چل رہی ہے ڈاکٹر جی۔ چل نہ رہی ہوتی تو چار کندھوں پر سوار کرکے لانا پڑتا۔''

''لانا نہ پڑتا واپس لے جانا پڑتا۔'' میں نے اُنھی کے انداز میں درستی کی۔

نبض کی رفتار نوٹ کرنے کے بعد چند قدم ہی چلا تھا کہ تیز چلنا مجبوری بن گیا۔ مجھے لگا جیسے ایکسرسائز شروع ہونے سے پہلے دل نے سٹریس ٹیسٹ کے پہلے مرحلے کا اعلان کردیا ہے:

آگے جو چل رہا ہے وہ آہستہ کیوں چلے
پیچھے سے اک حسیں چلی آتی ہے تیز تیز

سرخ جیکٹ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی (یا شاید جان بوجھ کر پھاڑی ہوئی) نیلی جین میں زبردستی پھنسی ہوئی ''ٹریکری'' مرمّت شدہ دل والے بزرگ سے آگے نکلنے کی کوشش کرے، تو دلِ ناتواں ایک عجب الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ گزرنے دے؟...... نہ گزرنے دے؟...... بس ساتھ ساتھ رکھے

نادان بزرگ اگر حسنِ رفاقت پر فدا ہونے کی بجائے زور آزمائی پر اُتر آئے اور ہانپتے کانپتے ہی سہی، مقابلہ برابر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو الجھن سلجھنے کی بجائے اور الجھ جاتی ہے:

سٹریس قدم بہ قدم بڑھتی جاتی تھی؟...... یا نظر بہ نظر گھٹتی جاتی تھی؟

بلندی سر کرنے کے بعد بھی نبض کی رفتار متوازن رہی تو مقابلہ برابر کرنے کا لطف دوبالا ہو گیا مگر...... حسن ہم قدم ہوا اور دل کی دھڑکن قابو میں رہے...... بابا جی...... یہ کون سی شرافت ہے؟

دل کی دھڑکن میں توازن آ چلا ہے خیر ہو
دل کے جذبے گل ہوئے یا گل کی رعنائی گئی

گل کی رعنائی تو پھٹی ہوئی جین سے پھوٹی پڑتی تھی...... جذبے ہی گل ہو گئے ہوں گے۔

پھر یوں ہوا کہ رعنائی بھی چلی گئی...... اُس نے بلندی پر پہنچ کر دونوں جانب نظر آنے والے منظر کی ویڈیو بنائی اور بیس کیمپ کی طرف اُترنے کی بجائے روپل کی سمت واپس چلی گئی۔

میرا خیال تھا قاسمی صاحب بہت آگے جا چکے ہیں۔ انھوں نے میری قدم آزمائی نہیں دیکھی ہو گی۔ مگر انھوں نے اپنی موجودگی کا اعلان بلند آواز میں کیا۔

چل دیے تم جو دل توڑ کر...... یوں اکیلا ہمیں چھوڑ کر...... اس کیمپ کے ہر اک موڑ پر...... ہمیشہ ہمیں...... تیری کمی...... محسوس ہو گی۔

''کیوں نہ محسوس ہو؟ رنگینی چلی گئی، سنگینی یہیں چھوڑ گئی۔''

میں نے قاسمی صاحب کی گنگناہٹ کے جواب میں رنگینی کہتے وقت روپل گاؤں کی طرف اور سنگینی کہتے وقت قاسمی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ پھر مشکوک انداز میں سوال کیا۔

''بائی داوے، آپ ابھی تک یہاں کر کیا رہے ہیں؟''

''اپنے ڈاکٹر بھیّا کا خیال آ گیا تھا۔ انھیں اترائی سے ڈر لگتا ہے نا۔ میں نے سوچا لڑھک گئے تو کون سنبھالے گا؟ رنگینی تو دل توڑ کر چلی گئی۔'' قاسمی صاحب نے معصومیت کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے اُس اترائی سے ڈر لگتا ہے جہاں اُلٹ پلٹ ہونے کا خطرہ ہو۔ یہ بہت معصوم سی

اُترائی ہے۔ اس نیک نیتی کا شکریہ قبول فرمائیں بہ شرطے کہ نیت واقعی نیک ہو۔ اور ہاں، رنگینی چلی گئی ہے تو سنگینی بھی چلتی پھرتی نظر آئے، خواہ مخواہ دل نہ جلائے۔''

قاسمی صاحب میرے الفاظ اور انداز سے حیران ہوئے۔ سچ پوچھیں تو میں خود بھی ہوا۔

وہ چند سیکنڈ تشویشناک نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے، پھر پوچھا:

''ڈاکٹر جی خیر تو ہے نا؟ اچانک جدائی سچ مچ دل ٹوٹنے کا سبب تو نہیں بن گئی۔''

''سر جی، دل نادان ضرور ہے، بے وقوف نہیں۔ اُترائی کے بعد والا منظر دیکھ کر البتہ مایوسی ہوئی ہے۔ بلندی سے عام طور پر بہت خوب صورت منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ اتنا بے رنگ کیوں ہے؟''

''کمال ہے۔ ابھی سے مایوسی۔ اسے منظر نہیں راستہ سمجھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سنگلاخ اور دشوار گذار راستے ہی فطرت کی دلکشی اور رعنائی تک لے جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے سر جی۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ فی الحال ذرا اُترائی سے نمٹ لیں۔''

اُترائی اندازے سے زیادہ معصوم ثابت ہوئی۔ ہنستے کھیلتے گزر گئی۔

اب گلیشیر اور پہاڑ کے درمیانی علاقے میں پتھروں اور مٹیالے سنگریزوں کا بے ہنگم سلسلہ سامنے تھا۔ ان مٹیالے اہراموں میں دل کشی کا کوئی عنصر نظر نہیں آ رہا تھا، اس لیے پہلی نظر میں مایوسی ہوئی۔ میں نے چند ثانیے رک کر خود کلامی کی ا:

''تم ان پتھروں پر چل کر کہکشاں تک پہنچنا چاہتے ہو؟ بڑے ناسمجھ ہو یہ کیا چاہتے ہو؟ عقل سے کام لو۔ اس عمر میں ٹھوکریں کھاتے پھرنے سے بہتر ہے کہ یوٹیوب پر وی لاگ اور فیس بک پر تصویریں دیکھ کر منظر پرستی کا شوق پورا کر لیا کرو۔''

مایوسی اور خود کلامی گواہی دے رہے تھے کہ پتھروں پر چلنے والا ہر شخص کوہ نورد نہیں ہوتا۔

کوہ نورد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنگلاخ میدانوں اور ہولناک ویرانوں سے شرابِ مسرّت کشید کرنے کا فن جانتا ہو؛ اور جسمانی آنکھ سے زیادہ دل کی آنکھ سے دیکھنے کا ماہر ہو۔

فطرت کی دیوی اپنی بارگاہ میں آنے والوں کی نیت کا امتحان نہیں لیتی۔ جذبے دیکھتی ہے اور ایک آدھ اَنگ دکھا کر حوصلہ بڑھا دیتی ہے۔ میری بددلی دور کرنے کے لیے اس نے اپنے لازوال حسن کی معمولی سی جھلک دکھائی۔

خاموش پانیوں کے نیلے کینوس پر ننگا پربت کا سفید عکس پینٹ کر دیا۔

اس جھیل کے چاروں طرف شاداب ہریاول کا گھیرا تھا جس میں چند رنگ برنگے پھول بھی نظر آئے۔ جھیل کی تہہ میں سنہری اور سبز ریشے تیرتے پھر رہے تھے۔ پتا نہیں یہ کیا چیزیں تھیں اور کہاں سے آئیں تھیں، مگر اس چھوٹی سی جھیل میں عجب رنگ بھر رہی تھیں۔

ہم کتنے چھوٹے چھوٹے بہلاووں سے بہل جاتے ہیں؟

جھیل کے قریب سے گزرنے والی پگڈنڈی بائیں طرف والی پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر آگے جا رہی تھی۔ یہ موڑ مڑتے ہی حسن کے کچھ اور گوشے بے نقاب ہوئے۔

تنگ وادی میں وسعت پیدا ہوئی اور سبزے پر نکھار آ گیا۔

جھرنے گنگنانے لگے اور مستی بھری ہواؤں کے دل بہار جھونکے سرسرانے لگے۔

یہ جھونکے نانگا پربت کے جھرنوں سے جنم لیتے ہیں اور بیس کیمپ کی آمد کا اعلان کرتے ہیں۔
ایک جھرنے کے پانی سے جنم لینے والا پہاڑی نالا میدان سے گزرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ رہا تھا، گویا بہتے پانیوں کی نمائش لگی ہو۔ نالے کے بہاؤ میں رکاٹ بننے والا چبوترہ نما پتھر اُس نمائش گاہ میں ''آبی تخت'' بن کر نمایاں تھا۔ اس پتھر پر سے گزرنے والا پانی موتیوں کی جھالر بن کر نیچے گرتے ہوئے ننھے منّے آبشاروں کا سا تاثر دے رہا تھا۔

آبی تخت کی ہمواری دیکھ کر من میں چھپا ہوا بچہ مچل مچل کر ضد کرنے لگا:
''جوگر اُتارو، پائینچے چڑھاؤ، تخت پر بہنے والے پانی میں سے گزرو، جھرنے کے کنارے بیٹھ کر کملائے ہوئے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارو...... اور من کی پیاس بجھاؤ۔''

میں نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر من کی اور چلّو بھر بھر کر تن کی پیاس بجھائی۔

اس بچکانا حرکت سے حاصل ہونے والی تسکین محسوس کی جا سکتی ہے، بیان کرنا ممکن نہیں۔

قاسمی صاحب پانی کی بوتل بھول آئے تھے۔ یہ بہت بڑا جرم تھا، مگر اسی جرم نے بے نام جھرنے کو یادوں کے خزانے کا ایک ناقابلِ فراموش باب بنا دیا۔ اپنے جرم کا اعتراف ضروری نہیں، کیونکہ اپنی نااہلی کا الزام دوسروں پر رکھ کر شاد باد رہنا پاک سرزمین کا قومی شعار بن چکا ہے۔

اس قومی شعار پر عمل نہ کرنے کی سزا قانونِ اشرافیہ کے مطابق اڈیالہ جیل ہے۔

دے چکے اپنی صفائی؟...... اب چلیں آگے؟

جھرنوں بھرے میدان سے آگے تھوڑی سی چڑھائی تھی اور پھر آنکھوں کی تراوت کا نیا

سامان...... پھولوں بھرا سبز میدان۔ اس میدان کے بیچ سے صاف وشفاف پانی کا وہی نالا گزر رہا تھا جس نے چند لمحے پہلے آبشار میں تبدیل ہو کر من کی پیاس بجھائی تھی۔

پھولوں سے آگے کیمپ سائٹ کے خیمے اور بادلوں میں چھپا ہوا نانگا پربت، ٹریک کے پہلے وقفے تک پہنچنے کی خوش خبری سنا رہے تھے۔ پلّے روپل سے روانہ ہوئے ساڑھے تین گھنٹے اور جیپ سٹاپ سے چلے صرف ایک گھنٹا ہوا تھا کہ ہم نانگا پربت کے چرنوں میں پہنچ گئے۔

اس کے پہلے بیس کیمپ...... ہرلی کوفر بیس کیمپ (HERLIGKOFFER-BC) پر

یہ ہمارے راستے کا ایک مختصر سا وقفہ تھا۔ مگر اس کا منظر نامہ چیخ چیخ کر احتجاج کر رہا تھا:

''مجھے وقفہ کیوں بنایا؟ پڑاؤ کیوں نہیں؟''

اگر بیس کیمپ ٹریک کا مقصد نانگا پربت کا دیدار ہے، تو یہاں پہنچ کر وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ نانگا پربت کا برفانی تاج محل نظروں کے بالکل سامنے، دائیں جانب سرسبز ڈھلوانیں، بائیں طرف گلیشیر کی سرمئی دیوار، قدموں میں رنگا رنگ پھول اور کہیں دور...... بہت دور پھوٹنے والے چشمے کی موسیقی...... یہ ایک بھرپور اور متوازن منظر نامہ ہے، جس کے لیے الگ سے بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔

نانگا پربت کے اس بیس کیمپ کا مقامی نام بازن (BAZEN) ہے۔

مقامی پورٹر اسے بے ینگ اور بعض اوقات بیانگ بھی کہہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ سب ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ ہوں اور ''بے ینگ'' انگریزی لہجے میں بگڑ کر بازن بن گیا ہو۔

ترکی زبان میں بازن سے ملتا جلتا ایک لفظ پہاڑ کے دامن میں کچی مٹّی سے بنائے گئے جھونپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بازن کے معنی رکھوالا اور اپنی مملکت کا آپ بادشاہ بھی ہیں۔

نانگا پربت سے اترنے والا گلیشیر اور اس کے دامن میں بچھا ہوا سبزہ زار دونوں تعریفوں پر پورا اترتے ہیں۔ گلیشیر نانگا پربت کے تسخیر ہونے تک اُس کی دوشیزگی کی رکھوالی کرتا ہوگا اور سبزہ زار میں بکر والوں کے کچے جھونپڑے رہے ہوں گے۔

نانگا پربت کی تسخیر کے بعد بازن بیس کیمپ ڈاکٹر کارل ماریا ہرلی کوفر سے منسوب ہو گیا۔

تاہم اس نسبت کی بنیاد بازن کی بجائے نانگا پربت کے فیری میڈوز بیس کیمپ میں رکھی گئی۔

اس داستان کا آغاز ۱۹۳۴ء میں ہوا، جب دو سال پہلے ناکام رہنے والا جرمنی کا مشہور کوہ پیما ولی مرکل (WILLY MERKL) ایک مرتبہ پھر قسمت آزمانے آیا۔ قاتل پہاڑ نے اس مرتبہ واپس

جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ اپنی دس رکنی ٹیم سمیت ہلاکت خیز شکست سے دوچار ہوا۔

ٹیم کا سربراہ الفریڈ ڈریکسل کیمپ فور پر بلندی کی بیماری کا شکار ہوا۔ اُسے واپس کیمپ ٹو تک لایا گیا مگر وہ پھیپھڑوں میں پانی پڑنے کی وجہ سے جاں بر نہ ہوسکا۔

مہم جاری رکھی گئی۔ ولی مرکل سمیت تین جرمن کوہ پیما اور چھ نیپالی شرپا ۷۵۰۰ میٹر سے زائد بلندی پر پہنچ چکے تھے اور چوٹی سے صرف ۶۰۰ میٹر دور تھے کہ برفانی طوفان میں گھر جانے کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار گئے۔ الفریڈ ڈریکسل کو نانگا پربت کے چرنوں میں دفن کیا گیا۔

یہ مدفن اب ڈریکسل مونومنٹ کہلاتا ہے۔ ٹیم کے باقی ارکان بھی اسی جگہ دفن ہیں۔

ولی مرکل کے سوتیلے بھائی ڈاکٹر کارل ماریا ہرلی کوفر (DR-KARL-MARIA-HERLIGKOFFAR) نے اس المناک سانحے کے بعد اُس کی بے چین روح کو سکون پہنچانے کے لیے نانگا پربت کو سرنگوں کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میڈیسن کا پروفیسر تھا، کوہ پیمائی کے میدان میں بالکل اناڑی۔ اُس نے تجربہ کار کوہ پیماؤں پر مشتمل ٹیمیں تشکیل دیں اور قاتل پہاڑ سے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے نکل کھڑا ہوا۔

نانگا پربت کی ساخت ایک مثلّث سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا شمال مشرقی پہلو رائے کوٹ فیس، شمال مغربی دیامیر فیس اور جنوبی روپل فیس کہلاتا ہے۔ اسے اِنھی تین اطراف سے سر کیا جاتا ہے۔

رائے کوٹ فیس کے دامن میں شہرہ آفاق سبزہ زار کا نام فیری میڈوز ہے۔

ہرلی کوفر نے کوہ پیمائی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں اور ولی مرکل کی ٹیم کے بنائے ہوئے خاکوں اور نقشوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ۱۹۵۳ عیسوی میں رائے کوٹ فیس، یعنی فیری میڈوز سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ رائے کوٹ اُس وقت رکھیوٹ فیس کہلاتا تھا۔

یہ مہم کامیاب رہی اور اُس کی ٹیم میں شامل جرمن کوہ پیما ہرمن بوہل نے انتہائی نامساعد حالات میں آکسیجن استعمال کیے بغیر، تن تنہا نانگا پربت سر کر کے نئی تاریخ رقم کی۔

اُس وقت تک کوئی بھی کوہ پیما کسی آٹھ ہزاری چوٹی کو اکیلے سر نہیں کر سکا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں ۸۰۰۰ میٹر بلند پہاڑ کے ڈیتھ زون میں بوہل کی طرح رات گزارنے کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ آج کل تو یہ سوچنا بھی ممکن نہیں، فوراً ریسکیو کال چلی جاتی ہے۔

ہرمن بوہل کی کامیابی کے دو دن بعد ٹیم کے مزید دو ارکان بھی چوٹی تک پہنچ گئے۔

ہرلی کوفر نانگا پربت کی ایک شکست سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے نانگا پربت کو دوسرے

چہروں، دیامیر فیس اور روپل فیس سے بھی سَر کرنے کا عزم کر لیا۔

ہرمن بوہل کی پہلی مہم کے نو سال بعد ۱۹۶۲ء میں دوسری کامیابی بھی ہرلی کوفر ہی کے حصے میں آئی۔ اُس کی ٹیم کے جرمن کوہ پیما ٹونی کنشوفر (TONI KINSHOFER) نے تین رُکنی ٹیم کی قیادت کرتے ہوئے نانگا پربت کا دیامیر فیس سر کیا۔

ہرلی کوفر کا تجویز کردہ کنشوفر روٹ آج کل بھی نانگا پربت سر کرنے کا مقبول ترین راستہ ہے۔

اب صرف روپل فیس باقی رہ گیا تھا جو ہرلی کوفر کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔

اس رُخ سے اوپر تلے تین مہمات (۱۹۶۳، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۸ء) ناکام ہوئیں۔

تینوں کوششوں میں بازن میدان ہی بیس کیمپ بنایا گیا۔

نانگا پربت پر تیسری کامیابی کا سہرا بھی ہرلی کوفر کی ٹیم کے سر بندھا۔ اُس کی منتخب کردہ ٹیم میں شامل رائن ہولڈ میسنر اور اس کے بھائی گونتھر میسنر نے ۱۹۷۰ء میں جنوب۔ جنوب مشرقی رِج (SOUTH-SOUTH-EAST-RIDGE) کے راستے نانگا پربت سر کیا۔ یہ رِج اب میسنر برادرز روٹ کہلاتا ہے۔ چوٹی سر کرنے کے بعد جب موسم نے تیور بدلے تو دونوں بھائیوں نے اسی رخ سے واپسی کی بجائے شمال مغربی سمت، یعنی دیامیر فیس سے اترنے کا فیصلہ کیا۔

اُترائی کے دوران برفانی طوفان نے دونوں کو جدا کر دیا اور گونتھر میسنر ایک برفانی تودے کی زد میں آ کر نانگا پربت کی برفوں میں ابدی نیند سو گیا۔

دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی کوہ پیما نے آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند چوٹی عبور کی، یعنی ایک رُخ سے چڑھ کر دوسرے رُخ سے نیچے اترا۔ یہ کارنامہ اب تک دہرایا نہیں گیا۔

یہ کارنامہ کوہ پیمائی کی تاریخ کا تابناک باب ہے اور المناک بھی۔

''نانگا پربت کے جھرنوں میں'' کا آخری باب (میسنر نامہ) اِس تاریخی کارنامے کے علاوہ اُن تنازعات، مقدمات اور الزامات کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے جو پینتیس سال تک کوہ پیماؤں کے حلقے میں زیرِ بحث رہے۔ کتاب میں ولی مرکل کی مہم اور ہرمن بوہل کے منفرد کارنامے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جگہ اتنی طویل خامہ فرسائی مناسب نہیں، صرف اشارہ کافی ہے۔

یہ اشارہ اگرچہ کافی طویل ہو گیا ہے مگر نانگا پربت کے دامن میں پہنچتے ہی اس سے وابستہ کارنامے دہرانے کو دل چاہتا ہے۔ خاص طور پر جب نانگا پربت کے دامن میں رائن ہولڈ میسنر

کے کارنامے کا اہم ترین حصہ خود اُس کی زبانی سنا ہو۔

نانگا پربت کے تینوں رُخ سر کرنے کی ہیٹ ٹرک مکمل کرنے کے بعد ہرلی کوفر کا انتقام پورا ہو گیا تھا اور اُسے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نانگا پربت کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی منتقم مزاج ثابت ہوا۔ اُس نے بازن بیس کیمپ سے چوٹی تک پہنچنے کے لیے دو نئے اور انتہائی دشوار گذار راستے دریافت کیے، لیکن نانگا پربت نے مزاحمت کا فیصلہ کر لیا:

بس بھئی بس زیادہ بات نہیں کوفرے...... آج کے بعد ملاقات نہیں کوفرے

روپل فیس پر ہرلی کوفر کی ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۲ء کی مہمات بری طرح ناکام ہوئیں۔

مشہور خاتون کوہ پیما وانڈا رُٹکے وِچ (WANDA RUTKIEWICS) ۱۹۷۶ء کی مہم میں شامل تھی۔ اس نے ہرلی کوفر پر آمریت اور نااہلی کے الزامات لگائے۔

وانڈا کا کہنا تھا کہ ہرلی کوفر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہ کرتا تو وہ نانگا پربت سر کرنے والی پہلی خاتون بن سکتی تھی۔ یہ اعزاز ۱۹۸۴ میں للّیانی بیراڈ نے حاصل کیا۔ وانڈا نے اگلے سال ۱۹۸۵ء میں نانگا پربت سر کیا اور ۱۹۸۶ء میں کے۔ٹو سر کر کے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی پر قدم رکھنے والی پہلی خاتون کوہ پیما بن گئی۔ وہ اگر ۱۹۷۶ء میں کامیاب ہو جاتی تو آٹھ ہزار میٹر بلند دو عدد چوٹیوں پر پہلا قدم رکھنے والی خاتونِ اوّل بن جاتی۔ یہ اعزاز رہتی دنیا تک قائم رہتا۔

ہرلی کوفر کے لیے ۱۹۸۲ء کی آخری مہم سب سے زیادہ مایوس کن ثابت ہوئی۔

اس کی ٹیم کا سوئس رکن ویلی بوہلر (WILLI BUKLER) نانگا پربت کی ۸۰۴۲ میٹر بلند جنوبی چوٹی تک تو پہنچ گیا، مگر برفانی طوفان نے راستہ روک لیا۔ جنوبی چوٹی تک پہنچنا اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کارنامہ تھا۔ نانگا پربت کی یہ کنواری پہلی مرتبہ کسی کوہ پیما کے قدموں سے آشنا ہوئی تھی۔

سمٹ پیک (۸۱۲۵ میٹر) صرف تراسی (۸۳) میٹر فاصلے پر تھی۔

ویلی بوہلر نے ہرمن بوہل کا کارنامہ دہرانا چاہا، مگر ہمت ہار گیا۔

اس نے اپنے اور ہرلی کوفر کے سپنے جنوبی چوٹی کی برفوں میں دفن کیے اور دل شکنی کے عالم میں قائم چاند پوری کے حسنِ خیال پر گرہ لگاتے ہوئے واپس آ گیا:

قسمت تو دیکھ کاٹی کہاں برف نے ہے راہ
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

ہرلی کوفر کا سپنا اگرچہ پورا نہ ہو سکا، مگر اُس کے نقشے اور دریافت کیے ہوئے راستے بعد میں آنے والے کوہ پیماؤں کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

آسٹریا سے تعلق رکھنے والی ٹیم نے ہانس شیل (HANS SCHELL) کی قیادت میں روپل فیس کے جنوب مغربی رِج کے راستے ۱۹۷۶ء میں نانگا پربت سر کیا۔ اس راستے کی منصوبہ بندی ہرلی کوفر نے ۱۹۶۳ء میں کی تھی اور اسے کنشوفر روٹ کا نام دیا تھا۔ ہانس شیل کی کامیابی کے بعد یہ شیل روٹ کہلانے لگا اور کئی عشرے تک نانگا پربت سر کرنے کے لیے معیاری راستہ بنا رہا۔ گلوبل وارمنگ اور گلیشیرز میں ہونے والی اتھل پتھل کی وجہ سے شیل روٹ اب متروک ہو چکا ہے۔

ہرلی کوفر بیس کیمپ میں بیٹھے ہوں اور موسم صاف ہو تو نانگا پربت کا جنوب مشرقی رِج نظروں کے بالکل سامنے ہوتا ہے۔ ہرلی کوفر نے اس راستے کا خواب بھی دیکھا تھا جو ۱۹۸۵ء میں پولینڈ اور میکسیکو کی مشترکہ ٹیم نے پورا کیا۔

اس ٹیم کا ایک رکن پیوٹر کلموس (PIOTR KALMUS) برفانی تودے کی زد میں آ کر جان کی بازی ہار گیا۔ اُس کی قبر بازن بیس کیمپ کے ایک گوشے میں آج بھی موجود ہے۔

ابھی چلتے ہیں اُس کی قبر پر پھول چڑھانے

ولی مرکل کی روح کو شاید ابدی سکون مل چکا تھا اور ڈاکٹر کارل ماریا ہرلی کوفر اُس کے قاتل سے انتقام لے چکا تھا۔ وہ ستمبر ۱۹۹۱ء میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہرلی کوفر بیس کیمپ پر نانگا پربت کے دیدار سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے اس پر جان نچھاور کرنے والوں کی آخری آرام گاہ پر حاضری دی۔ اسے ہرلی کوفر الپائنسٹ قبرستان کہا جاتا ہے۔

پتھروں کے بیچ سوئے ہوئے یہ لوگ شاید اب بھی روپل فیس پر کسی مہم کا خواب دیکھ رہے ہوں۔

نانگا پربت کے چرنوں میں بہت سے متوالے خوابیدہ ہوں گے، میری نگاہ دو ناموں پر ٹھہر گئی۔

پیوٹر کلموس اور جوئیل وشناسکی۔ پیوٹر کلموس کا ذکر ہو چکا، جوئیل وشناسکی کا افسانہ بھی سن لیجیے۔

فرانس سے تعلق رکھنے والا انتیس سالہ جوئیل وشناسکی تھوڑا سا گھوما ہوا تھا۔ گھوما ہوا نہ ہوتا تو فرانس جیسے دیارِ حسن سے نظریں چرا کر ایسے پہاڑ کے عشق میں مبتلا نہ ہوتا جسے جرمن کوہ پیماؤں کا قبرستان کہا جاتا ہے۔ نیپال کے اناپورنا اور پاکستان کے کے۔ٹو کے بعد نانگا پربت دنیا کا تیسرا خطرناک ترین پہاڑ ہے۔ اسے سر کرنے کی کوشش کرنے والے کوہ پیما اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آتے

ہیں۔اُن میں سے اکیس فیصد کبھی واپس نہیں جاتے۔اسی لیے یہ قاتل پہاڑ بھی کہلاتا ہے۔

جوئیل وشناسکی رومانی جنون اور بانکپن لے کر آیا۔وہ موسمِ سرما میں آکسیجن استعمال کیے بغیر اکیلے (SOLO) نانگا پربت سر کرنا چاہتا تھا۔اس طرزِ کوہ پیمائی میں پورٹرز بیس کیمپ سے آگے نہیں جاتے اور اور نہ ہی رسّے نصب کیے جاتے ہیں۔یہ ایک ایسی جنگ ہے جس میں کوہ پیما اور پہاڑ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تن تنہا کھڑے ہوتے ہیں......ہو جائیں دو دو ہاتھ؟

قراقرم اور ہمالیائی سلسلوں میں ۲۱ دسمبر سے ۲۰ مارچ تک کا عرصہ موسمِ سرما کہلاتا ہے۔اس دوران اگر کوئی مہم بیس کیمپ سے چوٹی تک پہنچ جائے، تو اسے مکمل سرمائی تسخیر کہا جاتا ہے۔اس سے پہلے شروع ہونے والی مہم کو جزوی سرمائی تسخیر (PARTIAL WINTER ASCENT) کا درجہ ملتا ہے۔

اُس وقت تک آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند چودہ چوٹیوں میں سے بارہ سرمائی مہمات کے دوران سر ہو چکی تھیں۔نانگا پربت اور کے۔ٹو باقی بچے تھے۔

دنیا کے مشہور ترین کوہ پیماؤں پر مشتمل تیس سے زیادہ ٹیمیں نانگا پربت کو سردیوں میں سر کرنے کی کوشش کر چکی تھیں مگر سب ناکام رہیں۔

جوئیل وشناسکی تاریخ بدلنے کا عزم لے کر جنوری ۲۰۱۳ء کے پہلے ہفتے میں ہرلی کوفر بیس کیمپ پہنچا۔چند روز تک اپنے جسم کو بلندی اور درجہ حرارت کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور پھر چڑھائی شروع کر کے کیمپ ون اور کیمپ ٹو قائم کیے۔یکم فروری کو وہ کیمپ ٹو کے خیمے میں پہنچا۔چار دن تک آرام کرنے اور اس بلندی پر ماحول سے مانوس ہونے کے بعد چھ فروری کو ٹوئٹر پر پیغام چھوڑا:

میں ۴۳۰۰ میٹر بلند کیمپ ٹو سے آگے بڑھ رہا ہوں۔میرے پاس تین دن باقی بچے ہیں (موسم کے مطابق چوٹی سر کرنے کے لیے)۔الوداع۔اپنا خیال رکھیں۔مجھے فالو کرنے کا شکریہ

اس کے بعد دس دن تک کوئی پیغام نہ آیا تو ریسکیو آپریشن شروع ہوا۔

ایک ہفتے تک تلاش جاری رہی۔کوئی سراغ نہ ملا تو اعلان کر دیا گیا کہ ایک فرانسیسی کوہ پیما قاتل پہاڑ سے مقابلہ کرتے ہوئے جان کی بازی ہار گیا ہے۔

تب احساس ہوا کہ ''تین دن باقی ہیں'' کی پیش گوئی دراصل قدرت نے کی تھی۔

جوئیل وشناسکی کی دیوانگی اگر کامیاب ہو جاتی تو کوہ پیمائی کی تاریخ کا ایک روشن ترین باب رقم ہوتا۔اُس کا منجمد جسم نو ماہ بعد اکتوبر میں چھ ہزار فٹ کی بلندی سے برآمد ہوا۔

جوئیل کی وصیت کے مطابق اُسے نانگا پربت کے قدموں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اگلے سال جوئیل وشناسکی کے والدین نے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ اُس کی آخری آرام گاہ پر پھول چڑھاتے ہوئے اُس کا ایک سوشل میڈیا پیغام دہرایا:

''انسان کی عمر ناپنے کا پیمانہ وقت نہیں زندگی گزارنے کا معیار ہے''

اس معیاری زندگی کو کچھ ''مذہب پرست'' (خدا پرست نہیں) خودکشی کہتے ہیں۔

فطرت کے پرستار اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ حسنِ تخلیق پر جان نچھاور کرنے کا جنون ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
اور لکھتے لکھتے دیکھیے جاں سے گزر گئے

میں نے جھاڑیوں سے کچھ پھول چنے اور پرستارانِ فطرت کی خواب گاہ پر رکھ کر دعا کی:

''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

قاسمی صاحب نے کھڑے کھڑے فتویٰ جاری کر دیا:

''غیر مسلم کے لیے مغفرت کی دعا حرام ہے۔آپ نے گناہِ کبیرہ کیا ہے، فوراً توبہ کریں۔''

شکر ہے کہ قاسمی صاحب فرقہ پرست مفتی نہیں ہیں، ورنہ گناہِ کبیرہ اور توبہ کی مہلت کے چکر میں نہ پڑتے، توہینِ مذہب کا فتویٰ لگاتے اور پھانسی کے پھندے تک پہنچانے سے پہلے دم نہ لیتے۔

جوئیل وشناسکی کے بعد تین سال تک نانگا پربت پر حکایاتِ خوں چکاں لکھنے والے آتے رہے۔

فروری ۲۰۱۶ء کے موسمِ سرما میں پہلی مرتبہ حکایتِ سرخ روئی لکھی گئی۔

اس سال تین ممالک کے پرچم بیک وقت نانگا پربت کی چوٹی پر لہرائے۔

پاکستان کے محمد علی سدپارہ، اٹلی کے سیمونے مورو اور اسپین کے الیکس چیکون نے آکسیجن سلنڈر استعمال کیے بغیر دیامیر فیس کے کنشوفر روٹ پر یہ کارنامہ سرانجام دیا۔کوہ پیمائی کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ موسمِ سرما میں آٹھ ہزار میٹر سے بلند کوئی چوٹی آکسیجن استعمال کیے بغیر سر کی گئی۔

محمد علی سدپارہ موسمِ سرما میں آٹھ ہزاری چوٹی سرنے والا پہلا پاکستانی کوہ پیما بن گیا۔

وہی محمد علی سدپارہ جسے جولائی ۲۰۲۱ء میں سوشل میڈیا کے سب ذرائع بُلا رہے تھے:

''تم چلے آؤ پہاڑوں کی قسم''

مگر وہ پہلے ہی کے۔ٹو کے برفانی معبد پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا تھا۔

کیا بلا کا لطف تھا ان پتھروں کے درمیاں

لونگ گواچا......کبھی آر کبھی پار......جوانی کا پیمانہ......ٹاپ نالا میڈوز

نانگا پربت کے فدائیوں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے بعد ٹریک کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ بازن گلیشیر کے مشرقی رِج کی چڑھائی دیکھ کر قدم ٹھٹک گئے۔ یہ اُس سے کہیں زیادہ عمودی تھی جسے میں نے دل کا سٹریس ٹیسٹ سمجھا تھا۔عبدالرؤف نے استور میں خبردار کیا تھا کہ ٹریک کی پہلی دشواری یہی چڑھائی ہے۔قاسمی صاحب دیکھتے ہی دیکھتے آدھی چڑھائی سر کر گئے اور میں آسمان سے باتیں کرتی پگڈنڈی کو دیکھتا رہا۔قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اتنے میں چند نوجوان قریب آ گئے۔اُن میں سے ایک نے شوخ لہجے میں پوچھا:

''آپ اوپر جانے کا تو نہیں سوچ رہے؟''

میں نے چڑھائی سے نظریں ہٹائے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چھوڑیں بابا جی۔کیوں مذاق کر رہے ہیں۔'' دوسرے نے گویا تمسخر اُڑایا۔

''میرا آپ لوگوں کے ساتھ مذاق کا کون سا رشتہ ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ،سوری انکل جی......میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

بات سنبھل گئی۔معلوم ہوا کہ فطرت پسندوں کا یہ گروپ لاہور سے آیا ہے۔

وہ لاتوبو بیس کیمپ کے بارے میں جانتے تھے،مگر یہ چڑھائی دیکھ کر دل چھوڑ بیٹھے تھے۔

اُنھیں علم ہوا کہ میں واقعی لاتوبو بیس کیمپ کے لیے آیا ہوں تو ایک نے دوسرے سے کہا:

''یار کچھ تو شرم کر۔چل ہم بھی نکل لیتے ہیں انکل جی کے پیچھے پیچھے۔''

''پچھے پچھے؟ مگر انکل جی لونگ پہنتے کہاں ہیں۔'' تیسرے نے مسکراتے ہوئے جگت لگائی۔

پہلے نوجوان نے اُسے ملامت آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے معذرت کی۔

''انکل جی پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔یہ سوچے سمجھے بغیر بکواس کر دیتا ہے۔''

''میں نے مائنڈ نہیں کیا۔فقرہ اگر تہذیب کے دائرے میں رہ کر چست کیا جائے تو تفریحِ طبع کا باعث بنتا ہے۔اس کا جملہ شوخی کے ساتھ ذہانت کی بھی دلیل ہے۔اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔''

''زندہ باد انکل جی۔اللہ کرے آپ کا سفر خیر خیریت سے گزرے۔'' جگت باز نے دعا دی۔

چڑھائی خلافِ توقع مہربان نکلی۔فوٹوگرافی کے لیے دو تین؛اور جبیں سے پسینہ پونچھنے کے لیے تین چار وقفے کرنا پڑے۔ہانپنے کانپنے کی نوبت نہیں آئی۔یہ آسانی شاید پلّے روپل سے ہرلی کوفر بیس کیمپ تک ہونے والی ''ٹیوننگ'' کا نتیجہ تھی۔یا پھر یادداشت کی سکرین پر مسرّت نذیر کا مسکراتا ہوا ''لونگ گواچا'' چل رہا ہوگا۔لونگ گواچا ''ویندے ویندے'' بندہ نجانے کیسی کیسی دلکش بلندیوں پر چڑھ جاتا ہے۔سوڈیڑھ سو میٹر بلند پتھریلے رِج کی اوقات ہی کیا تھی،بیس منٹ میں طے ہو گیا۔

بازن گلیشیر کے مشرقی رِج کی بلندی پر پہنچتے ہی فطرت کا انعام سامنے آیا۔

ایک طرف نانگا پربت کی برفوں پر تیرتی گھٹائیں۔دوسری طرف روپل پیک کی برفانی ریکھائیں

ایک طرف ہرلی کوفر بیس کیمپ کے جھلملاتے پانی اور شاداب سبزہ زار۔

دوسری طرف بازن گلیشیر کے دیو قامت مٹیالے پتھر،ننھی منّی گلیشیائی جھیلیں اور دراڑیں۔

میں پتھروں کے ایک کرسی نما ڈھیر پر بیٹھ گیا،بے خودی میں کھو گیا۔

کیا بلا کا لطف تھا ان پتھروں کے درمیاں
کیا بیاں ممکن ہے جانم؟ جانِ جاں ممکن نہیں

اس جگہ کا اصل لطف یہ تھا کہ فطرت کی خاموشی بھی گفتگو کر رہی تھی۔حوصلہ افزا گفتگو۔

دوسری طرف بازن گلیشیر کے وسطی مورین کی ایک کلومیٹر چوڑائی ہمارے سامنے تھی۔

اور بے تحاشا پتھریلی اترائیاں،چڑھائیاں بھی۔یہ ٹریک کا دوسرا کٹھن مرحلہ تھا۔

تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ آزمائش شروع ہو گئی۔

ایک ڈھلوان سے نیچے اترے تو بازن گلیشیر نے راستہ دکھانے سے انکار کر دیا۔ چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھروں کے اونچے اونچے ڈھیر تھے جن کے اُس پار نظر نہیں جاتی تھی......اور بیکراں سنّاٹا البتہ قدموں کے نیچے سے برف چٹخنے کی آوازیں گلیشیر کی برہمی کا اظہار کر رہی تھیں۔

ندیم حسین ہمیں بھٹکتا چھوڑ کر،اپنے گدھوں سمیت نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

ایک برفانی دراڑ کے پہلو میں چھوٹی سی گلیشیائی جھیل نظر آئی تو ہم چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول کر تصویر بنانے کے زاویے تلاش کرنے لگے۔

تصویر کے بعد پھر وہی سوال سامنے تھا۔دراڑ کے پار جائیں یا ساتھ ساتھ چلیں؟

ہم دس پندرہ منٹ تک کبھی آر کبھی پار...... کبھی اِدھر کبھی اُدھر میں الجھے رہے۔

اتنے میں پتھروں کے بلند و بالا ڈھیر پر سے ایک گدھابان اور تین گدھے اُترتے نظر آئے۔
ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ راستہ پتھروں کے اتنے اونچے مینار نما گنبد پر سے گزرتا ہوگا۔

گدھابان قریب آیا تو ہم نے اُس سے رہنمائی چاہی۔ اُس نے فرمایا:

''بس یہ راستہ پکڑ لو جس پر سے ہم آتا ہے۔ سیدھا لاتو بو پہنچ جائے گا۔''

''مگر اِن پتھروں سے آگے راستہ کیسے ملے گا'' میں نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آپ نے گھبرانا نہیں ہے صاب۔ گلیشیر پر سے سارا دن گدھا گزرتا رہتا ہے۔ گدھا نہیں ملتا تو اُس کا لید تلاش کرو۔ لید دیکھتے دیکھتے بھی سیدھا لاتو بو پہنچ سکتا ہے۔''

ہم نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل دیے۔

پتھروں کا ڈھیر عبور کرنے کے بعد کہیں گدھوں کی مدد لینا پڑی اور کہیں گہری سوچ بچار کی:

لاتو بو کس سمت ہے، کس راہ پہ پربت
پتھر پہ سنبھلتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے
بے نام سی اس راہ پہ کھوتوں کے سہارے
ہم اپنے لڑھکنے کا سبب سوچ رہے تھے

سب تو خیر اس عمر میں کیا سمجھ آتا

البتہ بازن گلیشیر کے دل پر جمی ہوئی بے رحم برف کچھ پگھل گئی۔

چڑھائیاں اور اُترائیاں ہموار ہوتی گئیں، چٹانی پتھر سنگریزوں میں بدلنے لگے۔

گلیشیر کا وسطی مورین ہم نے تقریباً ایک گھنٹے میں عبور کیا اور اس کے مغربی رِج کی اختتامی چڑھائی تک پہنچ گئے۔ چڑھائی کیا، یہ پورا پہاڑ تھا۔ شاید ہمارے ٹریک کا مشکل ترین مرحلہ۔

بازن گلیشیر ہم نے وادیِ روپل کے گدھوں کی رہنمائی میں پار کیا۔

ہمارا منتخب کردہ رہنما ہمیں پتھروں پر لڑھکتا اور بھٹکتا چھوڑ کر آگے نکل گیا۔

پس ثابت ہوا کہ ہمارے اصل رہنما گدھے ہیں۔

اور یہ بھی کہ منتخب رہنماؤں کا چلن ایک ہی ہوتا ہے...... اپنا اُلّو سیدھا کیا اور نکل لیے۔

لندن، دبئی، یا سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک کی طرف...... زیادہ ''غریب'' ہوئے تو جزیرہ خرید لیا۔

او مائی گاڈ۔ یہ ہم کس طرف نکل لیے۔ گلیشیر پر سفر کا سارا تاثر ہی بدل گیا۔

واپس آ جائیں بازن گلیشیر کے مغربی رج کی چڑھائی کی طرف، جو اچھی خاصی عمودی ہے۔

میں اس کے قدموں میں پہنچ کر رک گیا۔ قاسمی صاحب حسبِ عادت آگے نکل گئے۔

آدھی سے زیادہ چڑھائی طے کرنے کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میری ہمت بندھائی:

''ڈاکٹر جی آ بھی جائیں۔ معمولی سی چڑھائی ہے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''سر جی پریشانی چڑھائی کی نہیں بلکہ......''

''بلکہ کیا؟'' انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''راستے میں کسی گدھے نے آئینہ دکھا دیا؟''

''آئینہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور مجھے اس میں تھکن سے چور گدھے کی شکل نظر آ رہی ہے۔ اب ٹھنڈ پڑ گئی آپ کے سینے میں؟'' میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''واہ واہ ڈاکٹر جی! کیا بات ہے۔ زوجہ ماجدہ کا لہجہ اس ویرانے میں؟۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔''

اس جواب سے مجھے لطف لینا چاہیے تھا۔ قاسمی صاحب کے ساتھ تفریحی سفر یا ٹریک کی سب سے بڑی خوبی یہی نوک جھونک تو ہے۔ مگر نجانے کیوں زوجہ ماجدہ کی تشبیہ پر شدید غصہ آ گیا۔

اس بلا وجہ غصے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چڑھائی چڑھنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ٹریک کا مشکل ترین مرحلہ آرام کا وقفہ کیے بغیر آسانی سے طے ہو گیا۔ اوپر پہنچا تو قاسمی صاحب نے بغل گیر ہونے کے لیے بازو کھولے۔ میں توجہ دیے بغیر، چڑھی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کے لیے ایک بڑے پتھر پر جا بیٹھا۔

قاسمی صاحب قریب آئے اور میرے دونوں کندھے دبانے لگے۔

یہ اُن کی بہت پرانی ادا ہے۔ ہماری دوستی کی بنیاد اسی ادا نے ڈالی۔ انھوں نے غونڈ وغورو لا ٹریک پر جب مجھے تھکی ٹوٹی حالت میں ڈھیر ہوئے دیکھا، تو پنڈلیاں دبانا شروع کر دیں۔

اُس وقت تک شاید ایک آدھ جگہ سلام دعا ہوئی ہوگی...... کوئی خاص شناسائی نہیں تھی۔

وہ منظر یاد آتے ہی موڈ بدل گیا۔ مگر میں نے کوئی اظہار نہ ہونے دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔

قاسمی صاحب کندھوں کے ساتھ بازو بھی دبانے لگے اور گنگنانا شروع کر دیا:

بگڑے بگڑے مرے سرکار نظر آتے ہیں
آئینہ دیکھیے خرکار نظر آتے ہیں

بازن گلیشیر پر گدھوں کی صحبت میں چلنے کی مناسبت سے ''خرکار'' کی تک بندی سُن کر مزہ آ گیا۔ رہا سہا غصّہ فلک شگاف قہقہے میں ڈھل گیا۔ ہنسی رکی تو میں نے وضاحت کی۔

''سر جی معمول کی تھکاوٹ ہے۔ حلیہ بگڑنے والی کوئی بات نہیں۔ میں دراصل یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ واپسی پر جب یہ چڑھائی اُترائی بن جائے گی تو میرا کیا بنے گا۔''

''بنے گا کیا؟ زیادہ سے زیادہ انسان بن جائیں گے۔ اوہ...... معاف فرمائیے۔ میرا مطلب ہے کہ واپسی کی فکر بالکل نہ کریں۔ کسی آتے جاتے گدھے پر بٹھا کر نیچے اتار دیا جائے گا۔''

''آپ کی پتلی کمر یا میرا وزن سنبھال لے گی؟''

قاسمی صاحب نے عملی جواب دیا۔ مُٹھی چاپی چھوڑی، کیمرا پکڑ لیا۔

مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس ہوا۔ شدید تھکاوٹ کا ڈھونگ رچا کر مزید پانچ دس منٹ کندھے دبوانے کی عیّاشی کی جا سکتی تھی۔

بلندی سے دکھائی دینے والا منظر نامہ مصوّرِ فطرت کی ہدایت کاری کا کمال تھا۔

ایک شاندار فلمی سیٹ جس میں روپل پیک حسن کی دیوی اور ٹاپ (TAP, TUPP) میڈوز بارگاہِ حسن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ رائے کوٹ پیک اور نانگا پربت اس بارگاہ میں کسی ولن کی گھن گرج بنے کھڑے تھے؛ اور بے چاری روپل پیک...... لگتا تھا کہ رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی ہے۔

سطح سمندر سے ۵۶۴۲ میٹر بلند روپل پیک وادیِ روپل کی پہچان ہے اور اپنے نام کے معنی خود بتاتی ہے۔ میرے نام کے معنی ہیں چاندی جیسا روپ۔

چاندنی رات میں اس کی برفانی ریکھائیں یقیناً چاندی کے زیوروں کی طرح دمکتی ہوں گی۔

یہ چوٹی پہلی بار ۱۹۶۴ء میں سر ہوئی۔ آج کل زیرِ تربیت کوہ پیماؤں کے لیے تختۂ مشق سمجھی جاتی ہے۔ اس کے دامن میں ٹاپ میڈوز کے درشن ہوتے ہی اطمینان ہو گیا کہ ٹریک کے کٹھن مرحلے ختم ہو چکے ہیں، صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کی چہل قدمی باقی ہے۔

چنانچہ ہم آدھے گھنٹے تک نانگا پربت اور روپل پیک کے برفانی منظر پر کھیلی جانے والی فطرت کی آنکھ مچولی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

گلیشیر سے آگے کا سفر ایک تنگ پگڈنڈی پر شروع ہوا جو کئی موڑ مڑنے کے بعد ٹاپ میڈوز میں اُتر رہی تھی۔ ایک گھنٹے تک گلیشیر کے پتھروں سے نبرد آزما رہنے کے بعد یہ پگڈنڈی موٹر وے کی

طرح دکھائی دینے لگی اور ہماری رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ٹاپ میدان میں پہنچ گئے۔ یہ میدان ایک فطری آرام گاہ ہے۔

وسیع اور شاداب سبزہ زار جس کے درمیان ٹاپ نالے کا شفاف پانی بل کھاتا ہوا بہتا ہے۔ نالے کا بہاؤ خاصا منہ زور ہے جسے عبور کرنے کے لیے لکڑی کے تختوں کا پل بنایا گیا ہے۔

پُل کے اس پار ندیم حسین اور گدھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

گدھوں پر سے سامان اتارا جا چکا تھا اور وہ ہری ہری گھاس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ندیم حسین نے انگلیوں کی مدد سے وی (V) کا نشان بنا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ میں نے پل پار کرتے ہی دل کا سارا غبار نکال ڈالا اور ایک اچھے گائیڈ کے طرزِ عمل پر دھواں دھار خطبہ دیا۔

ندیم حسین نے باادب انداز میں سنا اور شرمندہ ہونے کی بجائے جوابی خطبہ ارشاد فرمایا:

''سر جی ایک تو آپ ویسے ہی آہستہ چلتا ہے۔ پھر اوپر سے فوٹو بنانے میں ٹائم ضائع کرتا ہے۔ ہمارے گدھوں پر سامان لدا ہوا ہے۔ اس حالت میں بے زبان جانور کو آہستہ چلنے پر مجبور کرنا ظلم ہے۔ ہم یہ ظلم نہیں کر سکتا اور نہ کرنے والے کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پھر ہم آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہے؟''

میں جواب دینے کی بجائے احمقانہ انداز میں اُس کا منہ تکتا رہ گیا۔

قاسمی صاحب طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ندیم حسین کی تائید میں سر ہلاتے رہے۔

میں انھیں نظر انداز کر کے پھول بردار جھاڑی کے پہلو میں سبزے کے فرش پر لمبا لیٹ ہو گیا۔

ٹریک کے دوران چند ایسے مقامات آتے ہیں جو بذاتِ خود منزل بن سکتے ہیں۔

ٹاپ میڈوز بھی ایسا ہی مقام ہے۔ اس چراگاہ کو یہ نام ٹاپ نامی چوٹی کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔ چوٹی کے گلیشیر سے نکلنے والا ٹاپ نالا اس سبزہ زار کو سیراب کرتے ہوئے روپل بالا پہنچ کر دریائے روپل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے روپل گاہ یا روپل ندی بھی کہتے ہیں۔

ہم چند منٹ پہلے ایک طویل سفری وقفہ کر چکے تھے، مگر ٹاپ میڈوز جیسے دلکش پڑاؤ سے سرسری انداز میں گزر جانا ذوقِ فطرت کی بدترین خلاف ورزی تھی۔

فطرت کدوں کے تاثّر کا انحصار موسم پر ہوتا ہے اور موسم اس وقت بڑا ''بئی مان'' تھا۔

قاسمی صاحب کے بقول ٹاپ میدان میں آفت اُتری ہوئی تھی اور شب باشی کے لیے خیمے لگانے اور تاروں بھری رات میں سٹار ٹریل عکس بند کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔

ندیم حسین کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے میں یہ دعوت قبول کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

عبدالرؤف کے ساتھ ایک اضافی دن کی بات ہوئی تھی، مگر وہ دن بیس کیمپ کے لیے تھا۔

میں نے ندیم حسین سے اس بارے میں بات کی تو اس نے کہا کہ اس جگہ خیمے لگائے جا سکتے ہیں، مگر کھانے کا بندوبست نہیں ہو سکے گا۔ کھانا لاتوبو پہنچنے کے بعد ہی ملے گا۔

ٹاپ میڈوز کے اُس پار بکروالوں کے بہک نظر آ رہے تھے۔ ہم اگر اُن سے درخواست کرتے تو کھانا ملنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ ہم نے بن بلایا مہمان بننا مناسب نہ سمجھا اور ٹاپ میڈوز کا قیام نمکو، جوس اور نماز کے وقفے تک محدود رکھا۔

وقفے کے بعد ندیم حسین نے سامان گدھوں پر بار کیا اور لاتوبو کے لیے سفر شروع ہو گیا۔

ٹاپ میڈوز میں ٹاپ نالے کے علاوہ اردگرد کی بلندیوں سے اترنے والے چھوٹے پانی بھی بہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے میدان کی گھاس بہت زیادہ گھنیری اور ہریالی ہے، گویا فطرت نے اپنی بارگاہ میں سبز مخملی قالین بچھا رکھا ہے۔

اس قالین سے اٹھتی نمی، جنگلی پھولوں کی خوشبو سے مل کر فضا میں ایک ایسی لطافت گھول رہی تھی جو رگ رگ میں اتر کر جسم و جاں میں تازگی کی لہریں دوڑا رہی تھی۔

ٹاپ میڈوز سے آگے دھوپ چندن اور چیڑ کے گھنے جنگل نے منظرنامے کے حسن میں اضافہ کیا۔ یہ منظر بھی فطرت نے خود اپنے ہاتھوں تخلیق کیا ہوگا۔ دھوپ چندن کے دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے پتے اور جنگل کا پس منظر بنانے والی برفانی چوٹیاں اس لفظ کے معنی اس انداز میں ذہن نشین کرواتی ہیں کہ بھلائے نہیں بھولتے۔ دھوپ چندن کو اردو میں صنوبری جھاڑی اور انگریزی میں جونیپر (JUNIPER) کہا جاتا ہے مگر ٹاپ نالا میڈوز کے پہلو میں نظر آنے والے جنگل کی اصل منظرکشی صرف دھوپ چندن کرتا ہے، صنوبر یا جونیپر نہیں۔

بلتستان کی دیومالائی داستان ''سومالیک'' میں چندن کو روئے زمین پر اُگنے والا پہلا درخت اور باقی سب درختوں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ دیومالائی دور کا چندن تقریباً نایاب ہے۔

دھوپ چندن شاید اُسی کی نسل سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ٹاپ میڈوز کے دھوپ چندن درختوں کی نگری کے شہزادے ٹھہرے۔ ان شہزادوں کی آن بان ہی نرالی ہے۔

ٹاپ میڈوز سے آگے پگڈنڈی مزید ہموار اور سماں مزید دل کش ہو گیا۔

نظروں کے سامنے خوب صورت برفانی چوٹیاں...... قدموں تلے جنگلی پھولوں کے جھرمٹ

ندیم حسین حسبِ عادت اپنے گدھوں کے پیچھے چھڑی ہلاتا ہوا کافی دور نکل گیا۔

ہم فوٹوگرافی کے وقفے کرنے کی وجہ سے اُس کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اُس نے بتایا تھا کہ پگڈنڈی پر ناک کی سیدھ میں چلتے رہیں تو کسی دشواری کے بغیر لاتوبو پہنچ جائیں گے۔

دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں پگڈنڈی دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔

دائیں جانب والی شاخ میری ناک کی سیدھ میں...... اور بائیں جانب والی قاسمی صاحب کی ناک کی سیدھ میں تھی۔

ہم آپس میں الجھ رہے تھے کہ کس کی ناک سیدھی لاتوبو تک جائے گی۔

میں قاسمی صاحب کے حق میں فیصلہ سنانے ہی والا تھا کہ ایک گدھا اور گدھے بان اپنی جانب آتے نظر آئے۔ ہم گدھے بان صاحب کو سلام کر کے فیصلہ کروانا چاہتے تھے، مگر اُنھوں نے سلام میں پہل کی اور ہاتھ ملانے کے بعد انتہائی پُرخلوص لہجے میں سفر کا حال احوال دریافت کیا۔

ہمیں اس پہل پر خوش گوار حیرت ہوئی۔ ہرلی کوفر بیس کیمپ سے ٹاپ میدان تک ملنے والے کسی بھی گدھے بان نے مخاطب کرنے میں پہل نہیں کی تھی۔ ہم نے جن لوگوں کو سلام کیا، وہ بھی ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے، اپنی راہ کھوٹی کیے بغیر قریب سے گزر گئے تھے۔

تعارف پر علم ہوا کہ اُن کا نام حسین احمد ہے اور وہ اپنے بھائی کے گھر راشن پہنچانے کے لیے لاتوبو جا رہے ہیں۔ قاسمی صاحب نے بتایا کہ اُن کا پورا نام حسین احمد مجاہد قاسمی ہے تو اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اُن کا گدھا ایک ٹانگ سے لنگڑا رہا تھا۔

گدھے کی معذوری اور ہماری تھکاوٹ...... دونوں کا آہستہ چلنا رفاقت کا سبب بن گیا۔

حسین احمد صاحب اپنے علاقے کے بارے میں معلومات کا خزانہ تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ ٹاپ نالے کا مقامی نام تاپ نیسنگ ہے اور یہ اسی نام کی چوٹی سے اترنے والے گلیشیر سے نکلتا ہے۔ انگریز کیونکہ ''ت'' نہیں بول سکتا، اس لیے ممکن ہے کہ تاپ ٹاپ میں بدل گیا ہو اور نیسنگ اپنا حلیہ بگڑنے کے خوف سے غائب ہو گیا ہو۔ حسین احمد صاحب نے معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ دائیں جانب نظر آنے والی جس پہاڑی کے پہلو میں ہم چلتے ہوئے آئے ہیں، اُسے مقامی باشندے سمیل کہتے ہیں۔ بیری نما جھاڑیاں جنھیں ہم صنوبر کی کوئی قسم سمجھ رہے

تھے شینا زبان میں چھلی اور اردو میں پدم کہلاتی ہیں۔ ان کے پھول اور پھل سانس کی بیماریوں اور نمونیا وغیرہ میں تریاق کا درجہ رکھتے ہیں۔

اُنھوں نے راستے کے کنارے اُگی جھاڑی سے قرمزی رنگ کا چھوٹا سا پھول توڑ کر انگلیوں میں مسلا اور ہمیں اُس کی خوش بو سنگھائی۔ اس پھول کا مقامی نام چُرکھی تھا جسے کھٹی بوٹی بھی کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے اپنی پگڑی میں رکھتے ہیں تا کہ اردگرد کا ماحول معطّر رہے۔ چُرکھی کی جڑیں، ڈنٹھل، پھل اور پھول یرقان، امراضِ چشم اور معدے کی بیماریوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے راستے میں نظر آنے والے بہت سے پودوں اور جڑی بوٹیوں کا تعارف کروایا جو روزمرّہ کے معمولی اور غیر معمولی امراض کا شافی علاج سمجھی جاتی تھیں۔

حسین احمد صاحب کا کہنا تھا کہ ٹاپ نالا میڈوز اپنے اردگرد بسنے والوں کے لیے مفت کی سبزی منڈی اور قدرتی شفا خانہ ہے۔ اس چراگاہ میں اُگنے والی جڑی بوٹیاں نہ صرف اُن کی خوراک کا حصہ ہیں بلکہ اِن کی مدد سے وہ اپنی بیماریوں کا علاج بھی کر لیتے ہیں۔

میں نے حسین احمد صاحب کی سنجیدگی کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے سوال کیا:

’’ٹاپ نی سنگ کے شفا خانے میں جوانی واپس لانے والی کوئی جڑی بوٹی نہیں پائی جاتی؟‘‘

حسین احمد صاحب بے تحاشا ہنسنے لگے۔

’’صاحب، جوانی واپس لانے والی بوٹی مل جاتا تو ہمارا بابا صاحب تیسری شادی نہ بنالیتا۔‘‘

’’آپ کے بابا صاحب کی عمر کیا ہے؟‘‘

’’پتا نہیں صاحب۔ وہ بولتا ہے کہ آزادی کا جنگ لڑا گیا تو چار سال کا تھا۔‘‘

’’یعنی اب اسّی برس کے آس پاس ہوگا۔ پھر بھی شادی بنانا چاہتا ہے؟‘‘

’’جوانی والا بوٹی مل جاتا ہے تو ضرور بنائے گا۔ کیوں نہیں بنائے گا؟‘‘

’’ہم نے سنا ہے کہ ادھر سلاجیت ملتی ہے جو بوڑھوں کو جوان بنا دیتی ہے۔‘‘

’’سلاجیت دوبارہ جوان بنا سکتا تو اُدھر کا سب لوگ چار چار شادیاں بناتا صاحب۔‘‘

’’یعنی روپل میں جوانی ناپنے کا پیمانہ شادی ہے۔‘‘

’’اس کا کیا مطلب بنتا ہے صاحب؟‘‘ اُنھوں نے سادگی سے سوال کیا۔

’’میرا مطلب ہے جس طرح آلو اور شلجم کلوگرام میں تولے جاتے ہیں اس طرح آپ لوگ

جوانی کا زور شادیوں کی تعداد سے تولتے ہو۔‘‘

حسین احمد صاحب ایک مرتبہ پھر زور سے ہنسے۔

’’آپ بالکل ٹھیک بولتے ہو صاحب۔ شادی بھی شلجم کی طرح ہوتا ہے۔ میٹھا نرم اور ملائم، اسی لیے تازہ تازہ اچھا لگتا ہے۔ پرانا ہو جائے تو مزہ نہیں دیتا۔‘‘

’’آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان پہاڑوں سے سلاجیت نکلتا ہے یا نہیں۔‘‘

’’اِدھر سے نہیں نکلتا صاحب۔ ہنزہ یا سکردو سے لانا پڑتا ہے۔‘‘

جوانی اور سلاجیت پر بات شروع ہو جائے تو بڑھاپے کی طرح لمبی ہوتی جاتی ہے۔

جوانی واپس لانے والی جڑی بوٹیوں کا موضوع شاید لاتوبو پہنچ کر بھی ختم نہ ہوتا، مگر لنگڑاتے ہوئے گدھے نے ایک جگہ رُک کر آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا تو جوانی کا نسخہ ادھورا رہ گیا۔

حسین احمد صاحب نے گدھے کی پیٹھ پر کئی ڈنڈے برسائے، وہ ایک جگہ کھڑا موٹے موٹے آنسو بہاتا رہا اور ڈنڈے کھا کھا کے بے حال ہو گیا تو بے چارگی کے عالم میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

حسین احمد صاحب اب تک گدھے کی لنگڑاہٹ کو معمولی سمجھ رہے تھے۔ اُس کی ابتر حالت دیکھ کر سخت پریشان ہو گئے اور کہا:

”صاحب لگتا ہے کہ ہمارا جانور اب آگے نہیں جا سکتا۔ ہم اسے اِدھر چھوڑ کر اپنے بکر وال دوست کی بہک سے دوسرا جانور لے آتا ہے۔ شام تک لاتوبو والے بھائی کے گھر راشن پہنچانا ہے۔‘‘

’’اور آپ کا گدھا یونہی پڑا رہے گا؟‘‘ قاسمی صاحب نے تشویش کا اظہار کیا۔

’’ارے نہیں صاحب، اسے ہمارا دوست سنبھالے گا۔ وہ سارا علاج جانتا ہے۔‘‘

ہم نے اُن کی رفاقت کا شکریہ ادا کیا۔ گدھے کی صحت و سلامتی کے لیے دعا کی اور اُنھیں اللہ حافظ کہہ کر لاتوبو کی سمت روانہ ہو گئے۔ لاتوبو جانے والی پگڈنڈی سیدھی تو نہیں، مگر دلکش بہت ہے۔ قدم قدم پر منظر بدلتا ہے اور ہر موڑ تصویر بننے کو بے تاب نظر آتا ہے۔ دھوپ چندن کے ساتھ ساتھ بھوج پتر اور بید مجنوں کے درخت بھی منظر نامے میں رنگ بھرتے ہیں۔ وضاحت کے لیے عرض ہے کہ بھوج پتر کو انگریزی میں برِچ (BIRCH) اور بید مجنوں کو وِلّو (WILLOW) کہا جاتا ہے۔

بھوج پتر اور بید مجنوں کے جلو میں، جھلملاتے ہوئے پانیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ٹاپ میڈوز سے روانہ ہونے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد اپنے آخری پڑاؤ...... لاتوبو پہنچ گئے۔

آ چلیں پھر جگنوؤں کے دیس میں

لاتوبو......نانگا پربت کے روٹ......خواب یا حقیقت......مقابلۂ حسن......لیلیٰ اور شیگری

''اچھا؟......تو یہ ہے لاتوبو؟'' میں نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ روپل فیس بیس کیمپ کا دل میں بسا ہوا عکس الٹ پلٹ ہو گیا ہے اور ہم جو چاند دیکھنے آئے تھے، گہنا گیا ہے۔ اس ٹریک کے خواب تعبیر سے زیادہ سہانے تھے۔

یہ تاثر بہت زیادہ مایوس کن نہیں تھا، مگر جسم میں سنسنی کی وہ لہر نہیں دوڑی جس کا برسوں سے انتظار تھا، جس کے لیے کوہ نوردی سے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لیا گیا تھا۔

لاتوبو نامی چھوٹی سی بستی نانگا پربت کے جنوبی پہلو میں آباد ہے۔

اس نام کی مناسبت سے بستی کے سامنے والا میدان لاتوبو میڈوز، اس کے قریب سے پھوٹنے والا چشمہ لاتوبو ندی اور قریبی بلندی پر پائی جانے والی جھیل لاتوبو جھیل کہلاتی ہے۔

لاتوبو میڈوز چاروں طرف سے ہمالیائی سلسلے کی بلندیوں میں گھرا ہوا ہے۔

شمال کی طرف پاکستان کی دوسری بلندترین چوٹی نانگا پربت
اُس کے بالمقابل روپل پیک کی ذیلی چوٹیاں
مغربی سمت ہمالیائی سلسلے کی اختتامی برف پوش چوٹیاں
اور مشرق میں وہی وادیاں جن میں سے گزرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔

سبزہ زار کے پہلو میں بہنے والی ندی کے صاف وشفاف پانیوں نے استقبالیہ دھن بجا کر خوش آمدید کہا۔ مقامی لوگ اسے سماٹ ندی کہتے ہیں۔ ہم سماٹ ندی کے تیز رفتار دھارے پر لرزتا ہوا چوبی پل عبور کر کے لاتوبو کی روایتی چراگاہ میں داخل ہوئے۔

بیس کیمپ کے تفصیلی جائزے نے احساس دلایا کہ پہلی نظر کا تاثر چند عارضی عناصر کی شرارت تھی، یہ فطرت کدہ بہت جلد اپنے اصلی رنگ روپ میں لوٹ آئے گا۔

ٹاپ میڈوز سے لاتوبو تک سورج کی کرنیں بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھیں۔

اب چاروں طرف گھنگھور گھٹاؤں کا راج تھا اور وہ برفاب بلندیاں بھی رخِ روشن پر نقاب

ڈال چکی تھیں جو راستے بھر جلوے بکھیرتی آئی تھیں۔ اس وقت منظر کچھ ایسا تھا۔

سرمئی چولی پہن کر ہر بلندی سو گئی
بجھ گیا تھا سارا منظر شام دھندلی ہو گئی

ہم نے علّامہ اقبال کے الفاظ میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے فطرت کی دیوی کو مکھن لگایا:

پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر
اک نظر دیکھ اِدھر ہم کو تماشائی کر

دیوی فطرت کی ہو یا حسن کی، ایک شعر کے مکھن سے رام نہیں ہوتی، پوری غزل لگانا پڑتی ہے۔ شدید تھکن نے غزل کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔

میں نے کیمرا بیگ سرہانے رکھا اور گھاس کے نسبتاً صاف قطعے پر لیٹ کر نانگا پربت کی سمٹ پیک کے تصوراتی درشن شروع کر دیے۔

کسی کے تصوّر میں کھو جانے کے بعد وقت کا احساس باقی نہیں رہتا۔

پتا نہیں کتنی دیر بعد مجاہد قاسمی صاحب کی منمناہٹ سنائی دی۔

''ڈاکٹر جی سانس چل رہی ہے یا اِناللہ پڑھ لیں؟''

''اناللہ پڑھنے کا وقت کب کا گزر گیا۔ اب تو سوال کریں کہ تیرا رب کون ہے۔''

''منکر نکیر گرما گرم چائے نہیں، آتشیں چابک لے کر آتے ہیں ڈاکٹر جی۔ زبان کھولنے سے پہلے آنکھیں کھول لیں تو بہتر ہوگا۔''

''گرما گرم چائے کہاں سے آگئی؟'' میں نے فوراً آنکھیں کھول لیں۔

''ہم لایا ہے صاحب اپنی پھپھو جان کے گھر سے۔ اور کہاں سے آسکتا ہے۔'' ندیم حسین نے شاپر میں بندھے ہوئے کپ کھنکھناتے ہوئے جواب دیا۔

خوش کن کھنک نے کچھ دیر کے لیے ندیم حسین کی پیشہ ورانہ غفلت کے گلے شکوے بھلا دیے۔

لاتوبو میڈوز میں پیش کیے جانے والا گرما گرم چائے کا کپ ٹم ہارٹن کے کافی کپ سے زیادہ خوش ذائقہ ''سڑکیلا'' اور فرحت بخش ہوتا ہے......کبھی آئیں ناں لاتوبو میں چائے کی سڑکیاں لگانے

چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ فطرت کی دیوی نے اپنے پرستار کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔

سرمئی چولی اتار کر سنہری انگیا پہن لی۔

یہ تبدیلی گواہی دے رہی تھی کہ فطرت کی دیوی مہربان ہونے لگی ہے۔لاتوبو کی بلندیوں سے بادل چھٹتے گئے اور سورج کی کرنیں دھیرے دھیرے زمین پر اُترنے لگیں۔

چراگاہوں سے واپس آتے ہوئے مویشی نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے اور لاتوبو میدان سورۃ النحل کی آیت ۱۶ کی جیتی جاگتی تفسیر بن گیا تھا:

”تمھارے لیے اُن میں زینت ہے جنھیں (مویشی) تم شام کے وقت گھر واپس لاتے ہو۔“

غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں جب بادلوں کے رخنوں سے گزر کر بھیڑ بکریوں کی اون پر پڑتی ہیں تو اُن کی زینت کا عالم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔لاتوبو کی بارگاہ میں آکر، قاسمی صاحب یا دوسرے مستند فوٹوگرافروں کو یہ ”آفت سماں لائٹ“ عکس بند کرتے دیکھ لیا جائے، تو اللہ کے فرمان کی صداقت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اور تفسیر پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

اس وقت لاتوبو کی مہکتی ہواؤں میں غیر معمولی حلاوت گھل گئی تھی۔

نانگا پربت کی برفیں صرف جنوبی سمت چمک رہی تھیں مگر اُن کی سفیدی لاتوبو میڈوز کے گوشے گوشے پر چھائی ہوئی تھی اور لاتوبو بیس کیمپ کے ابتدائی تاثر میں جاذب نظر رنگ اور امید کی نئی روشنی بھر رہی تھی۔

یہ منظر نامہ اس سوال کا جواب بھی دے رہا تھا کہ جب ہرلی کوفر بیس کیمپ سے نانگا پربت کا بھرپور منظر دیکھا جا سکتا ہے تو بازن گلیشیر عبور کر کے لاتوبو بیس کیمپ کی بامشقت حماقت کیوں؟

نانگا پربت لاتوبو بیس کیمپ کو ہرلی کوفر بیس کیمپ پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ منظر نامہ رائے کوٹ پیک اور نانگا پربت کی جنوبی چوٹی تک محدود نہیں رہتا۔

اس جگہ ایک نظر میں سات آٹھ چوٹیوں کا دیدار ہوتا ہے۔

اور یہاں دو ایسے منظر دیکھے جا سکتے ہیں جو دنیا کے کسی اور مقام پر نظر نہیں آتے۔

لاتوبو میدان میں کھڑے ہو کر نانگا پربت کی سمٹ پیک کی طرف دیکھیں تو نظروں کے سامنے دنیا کی بلند ترین برفانی دیوار (ICE AND SNOW WALL) ہوتی ہے۔اسے بلند ترین پہاڑی منظر (MOUNTAIN-FACE) کہا جاتا ہے۔ لاتوبو سطح سمندر سے ۳۵۰۰ میٹر، جب کہ سمٹ پیک ۸۱۲۶ میٹر بلند ہے۔ یہ دنیا کا اکلوتا مقام ہے جہاں سے ایک نظر میں ۴۶۲۶ میٹر بلند چٹانی اور برفانی دیوار دیکھی جا سکتی ہے۔نانگا پربت کی سمٹ پیک اس منفرد منظر نامے کا سرتاج ہے۔

نانگا پربت سلسلے کا مازینو رِج کوہساروں کی دنیا کا دوسرا منفرد منظر ہے۔

تقریباً تیرہ کلومیٹر طویل برفانی رِج مازینو پاس سے شروع ہوتا ہے اور آٹھ مختلف چوٹیوں کو شامل کرتا ہوا نانگا پربت کی سمٹ پیک تک جا پہنچتا ہے۔

دنیا میں اتنا طویل، حسین اور مسلسل برفانی رِج کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔

یہ رِج نانگا پربت سمٹ پیک تک پہنچنے کا طویل ترین راستہ بھی ہے جس کے ذریعے تاریخ میں صرف ایک مرتبہ یہ چوٹی سر کی جا سکی ہے۔

لاتوبو بیس کیمپ سے دیکھنے پر مازینو رِج کے کچھ حصے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

تیرہ کلومیٹر طویل منظر ایک نظر میں دیکھنے کے لیے تقریباً ایک گھنٹے مزید ٹریک کرنا پڑتا ہے۔

ان شاءاللہ کل صبح وہ منفرد منظر پوری آب وتاب کے ساتھ ہمارے سامنے ہوگا ۔

مازینو روٹ کا ذکر آیا ہے تو روپل فیس کے دیگر روٹس سے بھی آگاہی حاصل کر لیجیے۔

کوہ پیمائی کا مشغلہ کسی زمانے میں ذوقِ فطرت کی تسکین کا سامان تھا۔آج کل یہ کرکٹ کی طرح ریکارڈ بنانے اور توڑنے کا بین الاقوامی کھیل بن گیا ہے، جسے پیشہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

پبلسٹی کے لیے سپانسر کرنے والی کمپنیوں نے اس پیشے میں پیسے کی ریل پیل بھی کر دی ہے۔

آٹھ ہزاری چوٹی تک پہنچنے کے لیے نیا راستہ دریافت کرنے والے اور اُس راستے کے ذریعے پہلی مرتبہ چوٹی سر کرنے والے کے نام ریکارڈ بک میں سرِفہرست رکھے جاتے ہیں۔کوئی راستہ اگر کوہ پیما کے نام سے منسوب ہو جائے تو وہ نام اس کھیل کے باب میں امر ہو جاتا ہے۔

ندیم حسین نے نانگا پربت کی چوٹی تک جانے والے راستوں کے بارے میں معلومات فراہم کر کے پہلی مرتبہ شک پیدا کیا کہ اُس پر گائیڈ ہونے کا ”الزام“ بھی عائد کیا جا سکتا ہے۔

نانگا پربت سمٹ پیک تک جانے والے راستوں کے بارے میں بتانے سے پہلے اُس نے لاتوبو کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ”لات“ اور ”بو“ الگ الگ نام ہیں۔شینا زبان میں لات نشیبی جگہ کو اور بو غار کو کہتے ہیں۔نانگا پربت کے دامن میں بسائی گئی بستی نشیبی غار کی طرح ہے جو پناہ لینے والوں کو برفانی ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔اس قسم کا غار مقامی زبان میں لاتبو کہلاتا ہے جو انگریزی کے قالب میں ڈھلنے کی وجہ سے لاتوبو ہو گیا ہے۔مقامی باشندے لاتبو ہی کہتے ہیں۔

نانگا پربت روپل فیس پر روٹس کے بارے میں ندیم حسین کی فراہم کردہ معلومات تھوڑی سی

درستی اور ترمیم کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ پیش کش نانگا پربت سے خصوصی لگاؤ رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ دیگر احباب ''پاس'' کریا برداشت کر پر عمل کرتے ہوئے نظر خراشی کے لیے معذرت قبول فرمائیں۔

لاتوبو میڈوز میں ٹاپ نالے کے کنارے بیٹھ کر نانگا پربت کا دیدار کریں تو اُس کی چوٹی تک جانے والے کئی راستے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۔ منظر نامے کے انتہائی بائیں جانب یعنی مغربی سمت شہرہ آفاق مازینو رِج نظر آتا ہے جسے مغربی۔ جنوب مغربی رِج (WEST-SOUTH-WEST RIDGE) یا مازینو وال کا نام دیا گیا ہے۔

یہ چوٹی تک پہنچنے کا دشوار ترین اور طویل ترین راستہ ہے۔ اس رِج پر سب سے پہلے سفر کرنے کا اعزاز فرانسیسی کوہ پیما لوئی آڈوبرٹ (LOUIS AUDOUBERT) نے ۱۹۷۰ء میں حاصل کیا۔ اپنے وقت کے لیجنڈری کوہ پیما ڈگ سکاٹ نے اس راستے کے ذریعے نانگا پربت سر کرنے کے لیے تین مرتبہ کوشش کی اور تینوں مرتبہ ناکام رہا۔ سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے رچرڈ ایلن اور سینڈی ایلن ۲۰۱۲ء میں مازینو رِج کے ذریعے نانگا پربت کی چوٹی تک پہنچے۔

انھیں اس کارنامے پر کوہ پیمائی کے اعلیٰ ترین ایوارڈ پائلٹ ڈور (Piolets d'Or) سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ''گولڈن آئس ایکس'' اور کوہ پیمائی کا آسکر بھی کہلاتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان کا محکمہ سیّاحت پہاڑوں کی دنیا کے منفرد ترین منظر کی سیّاحتی اہمیت اُجاگر کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔

۲۔ مازینو رِج کی دائیں جانب، جنوب۔ جنوب مغربی رِج ہے جسے شیل (SCHELL) روٹ کہا جاتا ہے۔ آسٹریا کے کوہ پیما ہانس شیل نے ۱۹۷۰ء میں اس روٹ کے ذریعے نانگا پربت سر کیا۔ ۱۹۷۰-۸۰ کی دہائی میں یہ روٹ نانگا پربت سر کرنے کا معیاری راستہ سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ شیل روٹ کے دائیں جانب میسنرز برادرز (MESSNER BROTHERS) روٹ ہے جسے جنوب۔ جنوب مشرقی اُٹھان (SOUTH-SOUTH-EAST-SPUR) کہا جاتا ہے۔ اس روٹ پر ۱۹۷۰ء میں نانگا پربت ''عبور'' کرنے کی تاریخ ساز اور بے مثال داستان لکھی گئی۔

۴۔ میسنرز روٹ کے دائیں جانب (مشرق میں) ڈائریکٹ جنوب مشرقی رِج ہے جسے سنٹرل پلّر (CENTRAL-PILLAR) یا ہاؤس اینڈرسن روٹ کا نام دیا گیا۔

سنٹرل پلر چوٹی تک پہنچنے کا مختصر ترین، سب سے تیز رفتار، مگر مشکل ترین راستہ ہے۔ یہ روٹ

۲۰۰۵ء میں سٹیو ہاؤس (STEVE HOUSE) اور وِنس اینڈرسن (VINCE ANDERSON) نے دریافت کیا اور چوٹی تک پہنچ گئے۔ اُن کا یہ کارنامہ کوہ پیمائی کی عظیم ترین مہمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے صلے میں اُنھیں ۲۰۰۶ء کے پائلٹ ڈو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۵۔ سنٹرل پلّر کے دائیں جانب جنوب مشرقی پلّر (SOUTH EAST PILLAR) یا پولش میکسیکن روٹ ہے۔ پولینڈ اور میکسیکو کی مشترکہ ٹیم نے ۱۹۸۵ء میں اس روٹ کے ذریعے نانگا پربت سر کیا۔ یہ روٹ سنٹرل پلّر کے متوازی ہے اور اسے بھی مختصر ترین راستہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ وہ راستے ہیں جن کے ذریعے نانگا پربت سر کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ ڈائریکٹ جنوب مشرقی رِج اور ڈائریکٹ روپل فیس رِج پر بھی طبع آزمائی ہو چکی ہے۔

یہ تکنیکی معلومات بہ ظاہر انتہائی خشک اور بے زار کن ہیں، لیکن نانگا پربت سر کرنے کی افسانوی مہمات نظر سے گزر چکی ہوں تو بیس کیمپ سے چوٹی تک جانے والے راستوں کا منظر دیدار کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔

لاتوبو میڈوز میں شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور خنکی کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔

ندیم حسین اور قاسمی صاحب خیمہ نصب کرنے لگے۔ میں نے شدید تھکاوٹ کا بہانہ بنایا اور ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر اونگھنا شروع کر دیا۔ خیمہ نصب ہوتے ہی میں نے سامان اندر پھینکا اور میٹریس بچھا کر سلیپنگ بیگ میں داخل ہو گیا۔

مجاہد قاسمی صاحب چند منٹ بعد تشریف لائے۔ اپنے میٹریس کی جگہ بنانے کے لیے بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

''ڈاکٹر جی کیا حال چال ہیں؟ لگتا ہے پوری طرح ٹیں ہو گئے ہیں۔''

''ٹیں نہیں ڈھیں ہو گیا ہوں اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''اچھا؟ مجھے علم نہیں تھا کہ روپل فیس اتنا با کرامت ٹریک ثابت ہو گا۔'' قاسمی صاحب نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

''کیا مطلب؟ خود کو گدھا محسوس کرنا ٹریک کی کرامت ہے؟''

''اصل کرامت لاتوبو میڈوز کی ہے۔ اس میدان میں قدم رکھتے ہی آپ کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو گیا۔ کچھ لوگ ساری عمر کوشش کرنے کے باوجود یہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔''

''مجھے یہ عرفان بھی ہوا ہے کہ آپ سے چھوٹا ہوں۔'' میں نے باادب لہجے میں کہا۔

''خیر ہے ڈاکٹر جی۔ میرا خیال تھا کہ برسوں پرانی خواہش پوری ہونے پر خوشی سے باغ باغ ہو رہے ہوں گے۔ آپ الٹا خار خار نظر آ رہے ہیں۔ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟''

''سر جی صبح سے اب تک گدھے پہ گدھا دیکھتے ہوئے خود کو اُن کا بھائی بند سمجھنے لگا ہوں۔ لاتوبو پہنچ کر یہ گمان حقیقت میں بدل گیا ہے۔ روپل فیس سے بہتر تھا کہ ایک مرتبہ پھر رائے کوٹ فیس اور فیری میڈوز کا دیدار کر لیا جاتا، یا ہرلی کوفر بیس کیمپ پر رات گزار کر واپس چلے جاتے۔ لاتوبو بیس کیمپ پہنچ کر وہ خوشی نہیں ملی جس کے لیے یہ ٹریک کیا ہے۔ اس جگہ روپل فیس کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ رائے کوٹ فیس کا جمال نظر نہیں آتا۔''

''واہ......واہ......سبحان اللہ۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ڈاکٹر جی یہاں روپل فیس اور رائے کوٹ فیس کے درمیان مقابلہ حسن منعقد کروانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ آپ اگر فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے تو یاد کریں کہ ٹاپ میڈوز میں حسنِ فطرت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں بھی نہیں ہے۔ آپ کا حسنِ نظر گہنا گیا ہے۔''

''گدھے کسی بھی قسم کا حسنِ نظر نہیں رکھتے۔''

''ڈاکٹر جی یہ تبصرے صبح تک ملتوی کر دیں تو بہتر رہے گا۔ صبح ہوتے ہی آپ کا حسنِ نظر واپس آ جائے گا۔ گدھے والا نہیں، انسانوں والا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ لاتوبو کی صبح گدھے کو انسان بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''

''لاتوبو کی شاید نہ رکھتی ہو، شیگری کی رکھتی ہے۔ کل صبح وہاں چلیں گے۔''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے لاتوبو سے شیگری چار سے چھ گھنٹے کی سٹیج ہے۔ فوٹوگرافی کرتے ہوئے چلیں گے تو پورا دن لگ جائے گا۔ آپ آج رات وہاں قیام کرنا چاہتے ہیں؟''

''ہم ازابیل شا کے شیگری تک چلیں گے۔ وہ صرف تیس منٹ کی دوری پر ہے۔''

''ازابیل شا نے کوئی نیا شیگری دریافت کیا تھا؟''

''ازابیل شا نے اپنی کتاب میں لاتوبو سے شیگری تک واک کا دورانیہ تیس منٹ لکھا ہے۔ جان ماک کے مطابق یہ تین سے چار گھنٹے کا ٹریک ہے۔ آپ شاید جان ماک والے شیگری کی بات کر رہے ہیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی جھیل کے علاوہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہم نانگا پربت بیس کیمپ کے

لیے آئے ہیں۔ اس لیے ازابیل شا کے شیگری تک چلیں گے جو اس کیمپ کا حصہ ہے۔''

''جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔''

''صبح تک انتظار کر لیں۔ حسنِ فطرت کے سارے کرشمے واپس آ جائیں گے اور اپنے ساتھ آپ کی انسانیت بھی واپس لے آئیں گے۔'' قاسمی صاحب نے پتا نہیں تسلی دی، یا تمسخر اڑایا۔

ندیم حسین کھانا لے آیا تو روپل فیس اور رائے کوٹ فیس کا مقابلۂ حسن اختتام کو پہنچا۔

کھانا کل کے ڈنر کا سیکنڈ راؤنڈ تھا۔ دو اقسام کا ساگ، مکھن، چپاتی اور نمکین چائے۔

لاتوبو جیسی جگہ پر خاتونِ خانہ کے ہاتھ کا ذائقہ بہت بڑی نعمت ہے۔

پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

کھانے کے بعد نماز ادا کی اور سلیپنگ بیگ میں داخل ہو گئے۔ ٹریک کی ہر سٹیج پر نماز کے ذکر کا مقصد اپنی دینداری جتانا نہیں، ندیم حسین کی اکلوتی قابلِ تعریف خوبی کا اعتراف کرنا ہے۔

قاسمی صاحب ٹریک کے دوران نماز کی پابندی کرتے ہیں، میں عموماً سستی کر جاتا ہوں۔

اس ٹریک پر ندیم حسین نے کوتاہی کا موقع نہیں دیا۔ مجھے علم نہیں کہ وہ خود نماز پڑھتا تھا یا نہیں، ہماری نماز کا خیال ہم سے زیادہ رکھتا تھا۔ وقت ہوتے ہی وضو کے لیے گرم پانی لے کر حاضر ہو جاتا اور ہم فقہی مسائل نظرانداز کر کے جمع ''بین الصلوٰتین'' کر لیتے۔

اس وقت بھی وہ گرم پانی کا لوٹا لے آیا تو مغرب اور عشا کی نماز پڑھنا ''مجبوری'' بن گیا۔

وہ چند منٹ تاخیر کر دیتا تو میں سلیپنگ بیگ کی زِپ بند کر چکا ہوتا اور باہر نکلنے کا نام نہ لیتا۔

مجھے خدشہ ہے کہ فرشتوں نے میری نمازوں کا ثواب ندیم حسین کے کھاتے میں نہ ڈال دیا ہو۔

حق تو یہ ہے کہ حق بنتا بھی اُسی کا ہے......اللہ معافی۔

سلیپنگ بیگ کی زپ بند ہوتے ہی تھکاوٹ سے چور جسم نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ خواب میں بھی ڈھینچوں ڈھینچوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ایک مرتبہ آواز کی شدّت سے آنکھ کھلی تو یوں لگا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ اور یہ واقعی حقیقت تھی۔

لاتوبو کے ایک گدھے نے ہمارے خیمے کے قریب ڈیرا جما رکھا تھا اور وقفے وقفے کے ساتھ اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اُس کی آواز گراں گزرنے لگی تو میں ٹریکنگ سٹک کے طور پر استعمال ہونے والا ڈنڈا اُٹھا کر خیمے سے باہر آیا تا کہ اُس نامعقول گدھے کی خبر لے سکوں۔

خیمے سے باہر نکلتے ہی ایک غیر متوقع منظر نے میرے ساتھ اپنی سانسیں بھی روک لیں۔

یہ کوئی خواب سہانا ہے
یا حقیقت دلبرانہ ہے

لاتوبو نے آسمان کے سارے تارے کیسے چرائے اور انھیں آس پاس کی ڈھلوانوں اور روپل ندی کے پانیوں میں کیوں کر ٹانک دیا۔

اور یہ تارے بالکل ایک جیسے انداز میں کیسے ٹمٹمانے لگے؟

میں نے آنکھیں مل مل کر خود کو یقین دلایا کہ یہ منظر خواب نہیں، جیتی جاگتی حقیقت ہے۔

نجانے کتنی دیر بعد سمجھ میں آیا کہ لاتوبو میڈوز میں تارے نہیں اترے۔

جگنوؤں کے بے شمار قافلے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

بھیگی بھیگی فضاؤں پر سکوت طاری تھا۔ ایسے میں جھلملاتے ہوئے جگنوؤں نے کیا سماں باندھا؟

مجھے لگا کہ فطرت نے پوری کائنات کے لبوں پر چپ کی مہر لگا دی ہے۔

صرف اپنے حسن کو اجازت دی ہے کہ لاتوبو جائے اور راگ پہاڑی سنائے۔

پاکیزگی اور معصومیت کا کومل سا راگ...... چڑھائی میں سادگی، اتراؤ میں مٹھاس
پایل میں گیت ہیں چھم چھم کے...... تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے

چند لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ اس راگ نے پورے ماحول پر سکتہ طاری کر دیا ہے۔

ہلنے جلنے کی طاقت سلب کر لی ہے۔

میں شاید اُنھی کیفیات سے گزر رہا تھا جو حسن کی پرستش کرتے ہوئے طاری ہوتی ہیں۔

سپردگی...... سرشاری...... بےخودی...... بےیقینی...... حیرت...... اور حضوری

یہ خوش گمانی بھی ہوئی کہ لاتوبو میڈوز میں فطرت کی جادونگری کا سارا جادو اس لیے جگایا گیا ہے کہ گذشتہ شام مایوسی کا اظہار کرنے والے گستاخ کو منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔

ایسے جواب لینے کے لیے ہی دل ہر سال مچل اُٹھتا ہے:

آ چلیں پھر جگنوؤں کے دیس میں
روشنی شہروں میں گھٹتی جاتی ہے

راگ پہاڑی کو پرانی یادوں کی کیفیت کا راگ بھی کہا جاتا ہے۔

اس لیے بچپن کی بھولی بسری مگر جھل مل کرتی یادیں بھی لاتوبو کی حسین رات میں اتر آئیں۔

اُن دنوں فصلوں پر حیات کُش زہر چھڑکنے کا رواج نہیں تھا۔

دن میں بارش برستی تو رات کے وقت کھیل کھلیان نیلی پیلی روشنی میں نہا جاتے۔

ہم کوئی جگنو پکڑ کر ہاتھوں میں قید کرتے اور اُس کی جگمگاہٹ سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

وہ زمانہ چشمِ تصوّر کے سامنے سے گزرتا رہا اور میں تقریباً ایک گھنٹے تک اس منظر کا اسیر رہا۔

اگلے روز آرام کا دن ہوتا تو اُس وقت تک پتھر پر بیٹھا رہتا جب تک جگنو جگمگاتے رہتے۔

گدھے صاحب کی عین نوازش تھی کہ میری پرستش میں خلل نہیں ڈالا اور ڈنڈا استعمال کرنے کی نوبت نہیں آنے دی۔

مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ زیرِ لب گنگنا رہا ہے:

مان میرا احسان، ارے نادان، کہ میں نے تجھ کو کیا بیدار...... کہ میں نے تجھ کو کیا بیدار

اور جتا رہا ہے کہ لاتوبو کے گدھے بالکل ہی گدھے نہیں ہیں۔ آسمان سے روشنیاں نازل ہو رہی ہوں تو سوئے ہوئے مہمانوں کو جگانے کے لیے سائرن بجاتے ہیں۔

اس سائرن کو ڈھینچوں کہنا اپنے محسن کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔

میں نے احسان تسلیم کرتے ہوئے معذرت کی اور خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے شکریہ ادا کیا۔

ندیم حسین آدابِ رہنمائی سے واقف نہ سہی، آدابِ میزبانی سے پوری طرح واقف تھا۔

اس نے منہ اندھیرے گرم پانی کا لوٹا پیش کر کے خوابِ غفلت سے جگایا۔

صبح صادق کے وقت لاتوبو کے شدید برفانی ماحول میں گرم پانی کا لوٹا کتنی بڑی نعمت ہے؟

دنیاوی مال و دولت کا کوئی بھی پیمانہ اس ڈیڑھ لٹر پانی کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

ہم نے ندیم حسین سے فرمائش کی کہ شیگری تک ہمارے ساتھ چلے۔ اُس نے یہ کہتے ہوئے معذرت کر لی کہ وہ ناشتا بنانے میں اپنی پھوپی کی مدد کرے گا۔ ندیم حسین شیگری کے فاصلے کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات نہیں کر رہا تھا۔ کبھی تین کلومیٹر کہتا اور کبھی تین گھنٹے۔ ہم نے وقت اور فاصلے کی بحث چھوڑ کر فیصلہ کیا کہ ٹاپ نالے کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ گھنٹا سفر کرنے کے بعد سوچیں گے کہ مزید آگے جانا چاہیے یا واپسی مناسب رہے گی۔

ندیم حسین نے سات بجے تک واپس آنے کی ہدایت کی اور بستی کی طرف چلا گیا۔

ہم لاتوبومیڈوز سے گزر کر ٹاپ نالا (روپل گاہ۔روپل ندی) کے کنارے پہنچ گئے۔

ٹاپ نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے احساس ہوا کہ لاتوبومیڈوز اور فیری میڈوز کے درمیان مقابلۂ حسن یک طرفہ نہیں، کانٹے دار ہے۔اس نالے کے کنارے مارننگ واک لاتوبومیڈوز کی انتہائی دل کش انفرادیت ہے۔ہم جوں جوں آگے بڑھتے گئے وادی تنگ ہونے لگی اور نانگا پربت کے نقوش واضح ہوتے گئے۔لاتوبو کے وسیع منظرنامے کا حسن چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔

دائیں جانب رائے کوٹ پیک اور نانگا پربت کی ذیلی چوٹیاں، سامنے ایک دوسرے سے مختلف بناوٹ رکھنے والی برف پوش بلندیاں، عقب میں روپل پیک اور لاتوبومیڈوز، پہلو میں ٹاپ نالے کے جھلمل کرتے پانی اور پانیوں کے اُس پار سرسبز وشاداب بلندی۔مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنیں اس منظرنامے کو پگھلے ہوئے سونے سے غسل دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے کنکارڈیا کے سوا اتنا بھرپور اور متوازن منظر کسی اور بیس کیمپ پر نہیں دیکھا۔

مجاہد قاسمی صاحب نے کل شام ہونے والی گفتگو کی طرف توجہ دلائی:

''جی ڈاکٹر بھیّا، پوری ایمان داری سے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ انسانوں والا حسنِ نظر واپس آ گیا ہے، یا ابھی تک خواجہ خر پرست بنے ہوئے ہیں۔''

خواجہ خر پرست؟ یہ کوئی عام سا چٹکلا نہیں تھا، انتہائی دلچسپ اور کلاسیکل ادبی حوالہ تھا۔

میر امّن کی باغ و بہار، خواجہ سگ پرست اور اُس کے برادرانِ یوسف کا قصہ

اس قسم کے ادبی چٹکلے چند لفظوں میں پورا افسانہ بیان کر دیتے ہیں۔

میں نے لطف لیتے ہوئے جواب دیا:

''اب واقعی خر پرستی کو من کرتا ہے۔اس وادیِ خراں میں فیری میڈوز سے زیادہ بوقلمی ہے۔''

''بوقلمی پتا نہیں کیا بلا ہے مگر لگتا ہے کہ آپ گدھوں کی آنکھوں سے دیکھنے اور اُنھی کے ذہن سے سوچنے لگے ہیں۔لاتوبو کی خوب صورتی اور دل کشی اپنی جگہ مگر کوئی بوقلمی وقلمی اسے فیری میڈوز سے زیادہ پُرکشش نہیں بنا سکتی۔''

''میں نے لاتوبو کی بجائے فیری میڈوز جانے کی بات کی تو آپ نے لاتوبو کے حق میں ووٹ دیا تھا۔اب یوٹرن لے رہے ہیں۔'' میں نے یاددہانی کروائی۔

''یوٹرن نہیں لے رہا۔عرض کر رہا ہوں کہ اس ٹریک میں بھی قدم قدم پر فطرت کی رنگینیاں

سامنے آئی ہیں۔فیری میڈوز کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ایک بے مثال پکچر پوائنٹ ہے۔'' قاسمی صاحب نے وضاحت کی۔

''میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے کی بات نہیں کر رہا۔مگر اس حوالے سے دیکھا جائے تب بھی فیری میڈوز کا حسن ایک منظر میں قید نظر آتا ہے۔مجھے ٹاپ نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے احساس ہوا ہے کہ لاتوبومیڈوز کئی حوالوں سے فیری میڈوز پر فوقیت رکھتا ہے۔''

''مثلاً کس حوالے سے؟''

''میں نے گزارش کی ہے کہ فیری میڈوز کا سارا حسن ایک نکتے پر مرتکز ہے......''

''ڈاکٹر جی اس وقت کوئی ادبی گفتگو نہیں ہوری۔آسان اردو میں بات کریں۔''

''اچھا جی! یعنی میر امّن کے حوالے سے خواجہ خر پرست کا حوالہ ادبی گفتگو نہیں تھی؟''

''اوہ اب سمجھا۔وہ بوقلمی بھی اسی سلسلے میں نازل ہوئی ہوگی۔اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں جناب۔اب ذرا سیدھی بات کریں۔''

''سیدھی بات یہ ہے کہ فیری میڈوز کا سارا حسن ایک تصویر میں قید کیا جا سکتا ہے۔نانگا پربت کی برف پوش چوٹی اور اُس سے اُترتا ہوا رائے کوٹ گلیشیر، کبھی کبھار بننے والی جھیل اور اُس میں نظر آنے والا نانگا پربت کا عکس، گھاس چرتا ہوا مشکی گھوڑا، ایک آدھ بکری یا بھیڑ اور فیری میڈوز ختم۔ آپ کے پاس کوئی اور تصویر ہو جس میں یہ عناصر نہ ہوں اور وہ فیری میڈوز کے منظرنامے کی نمائندگی بھی کرتی ہو تو مجھے ضرور دکھائیں۔لاتوبو میں جس طرف آنکھ اُٹھائیں نئی تصویر یراں ہے...... پورب کا جہاں اور ہے، پچھّم کا جہاں اور...... اُتّر کا سماں اور ہے دکّن کا سماں اور............''

''ڈاکٹر جی میں آپ کو اتنا ہرجائی نہیں سمجھتا تھا۔کل فیری میڈوز کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے مجھے یوٹرن کا مجرم ٹھہرا رہے تھے۔اب خود یوٹرن لے کر لاتوبو کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ گدھے کو...... میرا مطلب ہے...... بندے کو اتنی جلدی الٹ بازی نہیں لگانا چاہیے۔''

''سر جی فیری میڈوز کے پری خانے میں جہاں پریاں اترتی تھیں اب وہاں باربی کیو نائٹ منانے والوں کے پرے کے پرے اُترتے ہیں۔ جہاں صنوبر اور دیودار فضا مہکائے رکھتے تھے وہاں دھوئیں کے مرغولے چھائے رہتے ہیں۔آج کل فیری میڈوز میں فطرت کا حسن زبردستی تلاش کرنا پڑتا ہے۔لاتوبو میں فطرت خود محسوس کرواتی ہے اور دیکھنے والے کی رگ رگ میں اتار دیتی

ہے۔ یہ انکشاف ابھی ابھی ہوا ہے اس لیے یوٹرن لینے پر شرمندگی نہیں ہے۔''

''یوٹرن لینے والے بڑے فن کار ہوتے ہیں ڈاکٹر جی۔ شرمندہ نہیں ہوتے ،علم و ادب کا رعب گانٹھ کر اپنی بات پر اڑ جاتے ہیں......واؤ......کیا خوب صورت پکچر پوائنٹ ہے۔''

یہ خوب صورت تصویری منظر لاتوبو سے بیس پچیس منٹ فاصلے پر ہے۔ اس جگہ ٹاپ نالے پر لکڑی کے تختوں کا پل بنایا گیا ہے اور پل سے آگے نالے کے چوڑے پاٹ نے چھوٹی سی جھیل کی شکل اختیار کر لی ہے جس میں برف پوش چوٹیوں کا عکس تھرتھراتا ہے۔ لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر اُٹھائے ایک بزرگ شخص نے پل عبور کرنا شروع کیا تو منظر نامے میں جان سی پڑ گئی۔

بزرگی کی جگہ ''جوانی'' ہوتی تو نئی جان پڑ جاتی مگر قاسمی صاحب اتنے بھی خوش قسمت نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بزرگ کے خط و خال میں چھپی ہوئی پورٹریٹ تلاش کر لی اور مختلف زاویوں سے عکس بند کرنے لگے۔ میں اردگرد کے مناظر دیکھ کر شدید حیرت کا شکار ہو گیا۔

مصوّرِ فطرت نے اتنی مختلف قسم کی رنگینیاں ایک منظر میں کیسے سمیٹی ہوں گی؟

کہاں سے رنگ اٹھائے گئے کہاں سے نقوش
جمالِ لات۔بو اپنی سمجھ سے باہر ہے

اللہ تعالیٰ کائنات کی اتنی متضاد رنگینیوں کو ارض و سما کا واحد خالق ہونے کا ثبوت قرار دیتا ہے۔
اس روشن استدلال کی شرح کتابوں میں بھی پڑھی جا سکتی ہے......مگر
لاتوبو اور شگیری اسے تصویر میں ڈھال کر سبحان تیری قدرت کا ورد کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

اس مقام پر ۴۶۰۰ میٹر بلند ماؤنٹین فیس یا پہاڑی دیوار کا منفرد منظر پورے ماحول پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کل شام نانگا پربت بادلوں اور دھند کے حصار میں تھا، اس دیوار کی شان و شوکت اور عظمت کا درست اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس وقت دنیا کی بلند ترین پہاڑی دیوار پورے جاہ و جلال کے ساتھ منظر نامے پر حاوی تھی۔

اس عظیم ترین دیوار کی انتہائی بلندی یعنی سمٹ پیک پر طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ فطرت نے برفانی اہرام کی چوٹی کے سر پر سونے کا تاج رکھ دیا ہے۔

مقامی باشندے اس پہاڑ کو شل مکھی (سو چہروں والا) اور دیامیر (پہاڑوں کا بادشاہ) کہتے ہیں۔
بادشاہوں کے سر پر سونے کا تاج ہی سجتا ہے۔

سمٹ پیک عموماً بادلوں میں روپوش رہتی ہے
مگر اس وقت فطرت کے ساتھ موسم کی عنایات بھی عروج پر تھیں۔
صاف و شفاف نیلے آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا
اور سمٹ پیک کو پہنایا گیا شاہی تاج، فطرت پرستوں کو آدابِ بندگی بجا لانے پر مجبور کر رہا تھا۔

اناطولی بوکریف نے شاید یہی منظر دیکھ کر کوہ پیمائی کے کھیل پر طنز کرتے ہوئے بیان دیا تھا:

''پہاڑ اسٹیڈیم نہیں ہیں جہاں مدّمقابل پر فتح حاصل کر کے انسانی جبلّت کی تسکین کی جائے۔ یہ فطرت کے گرجا گھر ہیں جہاں میں عبادت کرنے جاتا ہوں۔''

لاتوبو سے شگیری تک کا سفر علم و عرفان کے منظر نامے بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔
فطرت پسندوں کے اقوال، تجربات اور مشاہدات سمجھاتا رہتا ہے۔

''فطرت انسان کو خلوصِ دل سے خوش آمدید کہتی ہے اور نہایت فراخدلی سے اپنی دل کشی اور رعنائی نچھاور کرنا چاہتی ہے۔ انسان خوں آشام بھیڑیوں سے ڈر کر بھاگنے والی بھیڑوں کی طرح شہر کی گنجان آبادی میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور فطرت کی عنایت سے محروم رہتے ہیں۔''

شہر کی گنجان آبادی میں خلیل جبران کا یہ مشاہدہ شاعرانہ بیان لگتا ہے۔
اسے پرکھنے کی بجائے ڈرائنگ کی شان بڑھانے کے لیے دیوار پر ٹانگ دیا جاتا ہے
جان بروس فطرت کے حسن کو روحانی ٹوٹ پھوٹ کے علاج کا نسخہ سمجھتے ہیں:
''فطرت کدوں میں جاتے ہی میرے منتشر اعصاب یک جان ہو جاتے ہیں۔''
شگیری کے قریب نانگا پربت کے چرنوں میں کھڑے ہو کر
منتشر ہو جانے والے اعصاب دوبارہ یک جان کیے جا سکتے ہیں۔
اور فطرت کی رعنائیاں جھولی بھر بھر کر لوٹی جا سکتی ہے۔

مجاہد قاسمی صاحب فطرت کی رعنائیاں لوٹنے کے ساتھ ساتھ حسن کے چشمے بھی تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے شخص کا چھوٹا سا انٹرویو لیا۔

وہ صاحب لاتوبو گاؤں میں رہتے تھے اور ایندھن اکٹھا کر کے گھر واپس جا رہے تھے۔
قاسمی صاحب نے اُن سے دریافت کیا کہ شگیری اب کتنا دور رہ گیا ہے۔
''وہ شگیری نظر آتا ہے ناں۔''

اُنھوں نے انتہائی بائیں جانب نظر آنے والی برف پوش چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''شیگری اس چوٹی کا نام ہے یا کسی بستی کا؟''

''پہاڑ کا نام ہے ناں۔اس لیے سارا علاقہ شیگری کہلاتا ہے۔اِدھر لاتو بو جیسا بستی نہیں ہے۔''

''یعنی اس جگہ کو شیگری چوٹی کا بیس کیمپ کہا جا سکتا ہے؟''

''یہ اکیلا شیگری کا بیس کیمپ نہیں ہے۔اِدھر سے نظر آنے والی سب چوٹیوں کا بیس کیمپ ہے۔مازینو کا بھی، نانگا پربت کا بھی اور روپل کا بھی۔کلائمبر لوگ لاتو بو سے مازینو تک کسی بھی جگہ کیمپ لگا لیتا ہے اس لیے سارا علاقہ بیس کیمپ کہلاتا ہے۔''

''ان چوٹیوں کے نام کیا ہیں؟'' قاسمی صاحب نے سامنے والی چوٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''شیگری کے ساتھ والی چوٹی کو ٹورسٹ لوگ لیلیٰ پیک بولتے ہیں۔ ہمارا بزرگ لالی پیک بولتا تھا۔اب پتا نہیں یہ لیلیٰ ہے یا لالی ہے۔''

''یہ شاید لالی ہوگی۔لیلیٰ پیک وادیِ ہوشے میں ہے۔خیر لالی یا لیلیٰ سے آگے؟''

''لیلیٰ پیک کے بالکل ساتھ مازینو پیک ہے اور اس کے بعد نانگا پربت شروع ہو جاتا ہے۔ نانگا پربت اور مازینو پیک کے درمیان جو گیپ نظر آتا ہے اُسے مازینو پاس بولتے ہیں۔''

''ہم نے سنا ہے شیگری کے پاس کوئی جھیل بھی ہے۔وہ یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''ادھر کوئی خاص جھیل نہیں ہے۔شیگری گلیشیر کے اوپر چھوٹا سا جھیل ہے۔پتا نہیں آج کل اُس میں پانی ہوگا یا نہیں۔آپ لوگ اِدھر تک آ گیا ہے تو تھوڑا آگے جا کر مازینو پاس ٹرائی کرو۔ وہ بہت زبردست علاقہ ہے۔آپ کا دل خوش کر دے گا۔''

''صاحب اِدھر آتے آتے ڈھینچوں ہو گیا ہے۔مازینو پاس ٹرائی کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔صاحب شیگری اور لیلیٰ دیکھ کر اپنا دل خوش کر لے گا۔'' میں نے دخل اندازی کی۔

''ٹھیک ہے صاحب۔اچھی طرح دل خوش کرو۔ہم چلتا ہے۔ہمارا کمر تھک گیا ہے۔''

''سوری۔آپ کے بوجھ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔اللہ حافظ اور بہت بہت شکریہ۔''

ہم ساڑھے چھ بجے تک ٹاپ نالے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور صاف و شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے جو شاید کسی نقشے میں درج نہیں تھی۔

اپنے دل کی تسلی کے لیے ہم نے اسے منّی راما جھیل کی طرز پر منّی شیگری جھیل کا نام دے دیا۔

منّی شیگری جھیل کے خاموش پانی میں نیلے آسمان کی رنگت، برفانی چوٹیوں کی سفیدی اور گولڈن آور کی سنہری کرنیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔

لگتا تھا کہ فطرت نے اپنی رنگوں بھری پٹاری کھول کر شیگری، لیلیٰ اور مازینو پیک کے عکس منّی جھیل کے پانی پر نقش کر دیے ہیں۔

اس برفیلے دربارِ حسن کی ملکہ شیگری ہے۔یہ دلکش چوٹی ۵۵۸۴ میٹر بلند ہے اور اپنی مخروطی اُٹھان سے نظر اُٹھانے کا موقع نہیں دیتی۔اِس کے رُخِ زیبا پر برف کی سفید پٹی سنہری کرنوں سے گلے ملتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نئی نویلی سہاگن کی مانگ میں سندور بھرا گیا ہے۔

لیلیٰ کا بانکپن اس کے نام سے چھلکتا ہے۔یہ چوٹی سطح سمندر سے ۶۱۳۲ میٹر بلند ہے۔

میں اب تک پاکستان کی تین لیلاؤں کے درشن کر چکا تھا۔ ہوشے کی لیلیٰ، ہراموش کی لیلیٰ، نیلم کی لیلیٰ اور اب روپل کی لیلیٰ...... ہوشے کی لیلیٰ، لیلائے کائنات ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں۔

روپل کی لیلیٰ غالباً دوسرے نمبر پر آتی ہے۔باقی لیلائیں اپنے اپنے مجنوں سے رجوع کریں۔

مازینو رِج کی بلند ترین چوٹی، ۷۱۲۰ میٹر بلند مازینو منّی شیگری جھیل کا پس منظر بناتی ہے۔ اور کیا خوب انجمن آرائی کرتی ہے۔

شیگری کی دلکش صبح میں فطرت کی انجمن آرائی نے کیسی دھوم مچا رکھی تھی۔

شیگری کا وہ بانکپن، لیلیٰ کی ساری دل کشی
ذوقِ جمال کے لیے میرے وصال کے لیے

ہم نے اس پُر جمال وصال پر فطرت کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کا سفر شروع کیا۔

شیگری اور لیلیٰ پیچھے رہ گئیں، مگر ان کا عکس لاتو بو تک دل کے آئینے میں جھلملاتا رہا۔

ندیم حسین مقررہ وقت پر ناشتا لے آیا تھا۔ہم پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچے۔اس دوران لاتو بو کی یخ بستہ ہواؤں نے ناشتے کی صورت اور سیرت میں تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ پھر بھی پاپڑی پراٹھا، قلفی لسی اور شربت چائے فائیو سٹار بریک فاسٹ سے کم نہیں تھی۔

بہت بہت شکریہ ندیم حسین اینڈ پھپھو جانی

اللہ تعالیٰ ہر اِک گائیڈ اور پورٹر کی پھوپی یا خالہ کو اتنے دور دراز علاقے میں بسنے اور مہمان نوازی کے جذبے سے سرشار ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین......ثم آمین

کیا مستیاں تھیں اُس جگہ جوشِ بہار سے

سروٹ جھیل......راز و نیاز......میدانی گدھے......برائے نام خاتون......پچھتاوا

ناشتے کے بعد سامان سمیٹ کر خیمہ لپیٹ دیا گیا۔ اب ہمیں لاتوبو جھیل یاترا کے لیے جانا تھا۔ ندیم حسین نے بتایا کہ مقامی زبان میں یہ جھیل ''سروٹ سر'' یا سروٹ جھیل کہلاتی ہے۔ اس نے جھیل تک رہنمائی کرنے سے معذرت کر لی تھی۔

اُس کا کہنا تھا کہ گدھے جھیل کی پتھریلی چڑھائی نہیں چڑھ سکتے اس لیے وہ سیدھے راستے سے ٹاپ میڈوز پہنچ جائے گا اور ہمیں راستہ سمجھا دے گا۔ ہم جھیل درشن کے بعد اُس سے آن ملیں۔ یہ تجویز آدابِ رہنمائی کے خلاف تھی۔ ہم ندیم حسین کے غیر پیشہ ورانہ رویّے کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے چوں و چرا کیے بغیر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اُس نے ہدایات دیں:

''جھیل کا راستہ بالکل سیدھا ہے سر۔ سامنے جو سُنّی بستی نظر آ رہی ہے اُس کے پیچھے والی پہاڑی پر سیدھے چڑھتے جائیں۔ بڑے آرام سے جھیل تک پہنچ جائیں گے۔''

''سنّی بستی؟ یہاں بستیوں کے نام فرقے کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں؟'' میں حیران ہوا۔

''دونوں بستیوں کا نام لاتوبو ہے سر۔ ایک میں سنّی اور دوسری میں شیعہ رہتے ہیں۔ اس لیے انھیں سنّی لاتوبو اور شیعہ لاتوبو کہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ پندرہ بیس گھر بھی مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں؟''

''ادھر سب لوگ مل جل کر رہتا ہے سر۔ ایک دوسرے کا مدد کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔''

''پھر الگ الگ بستی بنانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مولوی صاحب تو الگ الگ ہے ناں سر۔ وہ گرما گرمی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے دونوں فرقوں نے مسجد اور بستی تھوڑا دور دور بنایا ہے۔''

مذہب کے نام پر اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ مٹھی بھر لوگ مولوی کی گرما گرمی سے تنگ آ کر الگ الگ بستیاں بسانے پر مجبور ہو جائیں۔

یہ المیہ علامہ اقبال سے منسوب ایک روایت میں بھی بیان ہوا ہے۔

انھوں نے حور کے پہلو میں مولوی کو منہ لٹکائے بیٹھے دیکھا تو سبب پوچھا۔ اس نے کہا:

''اب کیا بتاؤں حضرت! جنت میں حوریں تو ہیں، مگر نہ سنّی ہے نہ شیعہ، نہ دیوبندی نہ بریلوی؛ نہ مناظرے، نہ جلسے۔ اور تو اور، نماز بھی سب ایک جگہ پڑھتے ہیں۔ اب میں فتویٰ کس پر لگاؤں؟ بس یہ مسئلہ پریشان رکھتا ہے۔ دوزخ کی گرمیٔ محفل کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آہ و فغاں اور لعن طعن کا بازار فجر سے عشا تک گرم رہتا ہے۔ وہاں کا گرین کارڈ مل جاتا تو دل کچھ بہل جاتا۔''......اللہ معافی

جنت کے منظر کی گونج ابھی باقی تھی کہ بکری مدھانی سے لسّی بنانے کے منظر نے زمین پر اُتار لیا۔ ہم نے یہ روایتی آلہ یا مشکیزہ کئی بار دیکھا تھا۔ اِن ایکشن دیکھنے کا موقع پہلی بار مل رہا تھا۔

دو خواتین تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ بکری کی کھال سے بنائے گئے مشکیزے کے دونوں سرے پکڑ کر پوری قوت سے جھٹکے پہ جھٹکا لگا رہی تھیں۔

غالباً سرتاج کی فارغ البالی کا غصہ بے جان مشکیزے پر اُتار رہی تھیں۔ ٹھیک کر رہی تھیں۔

ہم نے ان علاقوں کے بیش تر مردوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے خوش گپیاں لگاتے اور بیش تر خواتین کو کھیت کھلیانوں میں کام کرتے دیکھا تھا۔ اس بستی میں نظر آنے والی سب خواتین کسی نہ کسی مصروفیت میں ''مبتلا'' نظر آئیں۔ وہ ہنڈی چولھا کر رہی تھیں، بکری مدھانی چلا رہی تھیں، بچے سنبھال رہی تھیں اور لاتوبو نالے کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں کپڑے دھو رہی تھیں۔

مرد حضرات پتھروں پر تشریف فرما ہو کر اپنی فراغت کا جشن منا رہے تھے۔

مجاہد قاسمی صاحب موبائل فون سے اس ثقافتی منظر کی ویڈیو بنانا چاہتے تھے مگر حضرات کی اشارہ نما دھمکی سے خوف زدہ ہو کر راستہ بدل دیا۔

ہمیں محسوس ہوا کہ سماٹ ندی کے پانی مدھم سروں میں جدائی کا نغمہ گا رہے ہیں۔ ہم اس نغمے کی لے پر قدم اٹھاتے ہوئے قدرے طویل چکر کاٹ کر بستی کے عقب میں پہنچے۔ ہمارے سامنے چھوٹی سی مگر اچھی خاصی عمودی چڑھائی تھی جس کے قدموں سے چوٹی تک پتھر ہی پتھر نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے، بڑے، گول، چوکور۔ قاسمی صاحب نے کچھ دیر غور و فکر کے بعد مناسب پتھروں کا انتخاب کیا اور انھیں ''پھلانگنا'' شروع کر دیا۔ میرے لیے اتنے لمبے قدم اُٹھانا ممکن نہیں تھا۔ آواز دے کر اُنھیں روکا اور درخواست کی کہ ساتھ ساتھ چلیں ورنہ میں راستے میں کسی جگہ لڑھک جاؤں گا، انھیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ انھوں نے درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا، مگر یہ قبولیت عارضی ثابت ہوئی۔

قاسمی صاحب بہترین ٹریکر ہیں، مگر ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے چلنے کی بجائے ان سے چار قدم آگے رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے اُن کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتھروں کی اوٹ میں غائب ہو گئے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اُنھیں آواز دی۔ اُنھوں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت کیے بغیر بلند آواز میں مشورہ دیا کہ سیدھی چڑھائی چڑھتے آئیں، دائیں بائیں نکلنے کی کوشش نہ کریں۔

میں اگر اُن کی طرح ''باندر پن'' کا مظاہرہ کر سکتا تو سیدھا اوپر کی طرف سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ مگر بعض جگہ پتھروں کا درمیانی فاصلہ قدم روک رہا تھا اور میں دائیں بائیں نکلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ سانس پھولنا الگ مسئلہ تھا۔ سیدھی چڑھائی چڑھتے ہوئے سانسیں اُتھل پتھل ہونے لگتی ہیں، تھوڑا سا دائیں بائیں ہونے سے اس دشواری پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ دائیں بائیں ہونے کا سلسلہ دراز ہونے لگا اور راستہ بھٹکنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو میں نے زچ ہو کر بلند آواز میں اطلاع دی:

''سر جی میں نہیں آرہا۔ آپ ہو آئیں، مجھے واپسی پر اسی جگہ سے اٹھا لیں۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ اتنا اوٹ پٹانگ راستہ طے کرتے ہوئے کسی کھائی یا کھڈے کی بھینٹ چڑھ گیا تو کیا ہوگا؟ مگر کہتے کہتے رہ گیا۔

ہمارے بہت پیارے اور نفیس طبع دوست چوہدری مشتاق علی کی سنائی ہوئی آپ بیتی نے مجھے اس خدشے کا اظہار کرنے سے باز رکھا۔ چوہدری صاحب مجاہد قاسمی صاحب کی رہنمائی میں گنگا چوٹی کی چڑھائی طے کر رہے تھے۔ قاسمی صاحب حسبِ عادت تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ چوہدری صاحب نے ایک عمودی چڑھائی پر قدم رکھنے کے بعد قاسمی صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ اُن کے ساتھ ساتھ چلیں ورنہ وہ پھسل کر نیچے گر سکتے ہیں۔

مجاہد قاسمی صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا:

''نیچے گر بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا چوہدری صاحب؟ فوت ہو جائیں گے؟ بے فکر ہو جائیں، مجھے نمازِ جنازہ آتی ہے۔''

یہ جواب سن کر چوہدری صاحب کے سر سے لگی تو تلووں میں بجھی۔ وہ شدید غم و غصّے کی تصویر بنے واپس چلے آئے۔ قاسمی صاحب نے چوٹی پر پہنچ کر نیچے بیٹھے ہوئے چوہدری صاحب کی تصویریں بنائیں اور واپس آ کر انھیں دکھانے کی کوشش کی۔ اس بے موقع کوشش نے جلتی پر تیل کا

کام کیا اور چوہدری صاحب نے قاسمی صاحب کے اندازِ رہنمائی پر آتش فشاں ردِّعمل کا اظہار کیا۔

میں نے چوہدری صاحب کی زبانی سنی ہوئی روداد کو مبالغہ آمیزی سمجھا تھا۔ مجاہد قاسمی صاحب نے خود اپنے الفاظ کی تصدیق کر دی اور اسے ہلکی پھلکی شگفتہ بیانی قرار دیا تو یقین آیا۔

لاتوبو جھیل کی چڑھائی پر چٹانی پتھر پھلانگتے ہوئے یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ:

نماز تم پڑھاؤ گے مرشد۔ نمازی کہاں سے لاؤ گے مرشد؟

میں نے مجاہد قاسمی صاحب کی شگفتہ شگفتہ ''نماز بیانی'' سے بچنے کے لیے اپنی پیش کش دہرائی کہ جھیل کی تصویریں بنا کر واپس آجائیں۔ مجھے یہیں آرام کرنے دیں۔

''یہاں آرام کرنے سے کام نہیں چلے گا ڈاکٹر جی۔ اسی راستے سے نیچے اُتر کر آگے جائیں گے تو بہت لمبا چکر پڑے گا۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ایک راستہ ٹاپ میدان تک جاتا ہے۔ ہم اُس راستے سے جائیں گے۔ اب آجائیں بچوں کی طرح ضد نہ کریں۔''

''آپ نظر آئیں گے تو آؤں گا۔'' میں واقعی بچوں کی طرح اُڑ گیا۔ کیوں نہ اُڑتا؟

گدھوں کی رہنمائی میں ٹریک کیا جائے تو اڑیل پن میں اضافہ ہو ہی جاتا ہے۔

قاسمی صاحب نے خلافِ توقع کسی شگفتہ بیانی کا مظاہرہ نہیں کیا اور چند قدم نیچے اُتر آئے۔ مجھے اُن کی جھلک نظر آئی تو اندازہ ہوا کہ لبِ بام واقعی دو چار ہاتھ رہ گیا ہے۔

میں نے سفر دوبارہ شروع کیا اور چند منٹ میں اُن کے قریب پہنچ گیا۔ میں سوچتا ہوا آیا تھا کہ اوپر پہنچ کر اُنھیں آدابِ رفاقت پر ملامت آمیز لیکچر دوں گا۔ ٹریک پر کوئی لمبی چوڑی ٹیم نہیں صرف دو آدمی ہیں۔ دشوار گذار راستے پر اگر وہ چند منٹ کے لیے بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے تو ایک ساتھ ٹریک کرنے کا کیا فائدہ؟ وغیرہ وغیرہ

قاسمی صاحب کو اس قسم کے نہ جانے کتنے لیکچر پلائے جا چکے ہیں۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دیتے ہیں، مگر دل کا غبار نکالنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اوپر پہنچتے ہی دل کا سارا غبار جمالِ یار کی نذر ہو گیا اور سوچے ہوئے الفاظ چشمِ تماشا کی بھینٹ چڑھ گئے۔

کیا مستیاں تھیں اُس جگہ جوشِ بہار سے
ہر شجرِ گل تھا ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے

جوشِ بہار اور مستیوں کا مرکز جھیل نہیں تھی۔ جھیل کا پانی تو گدلا بلکہ مٹیالا تھا جیسے کسی نے اس

میں اُجڑے ہوئے خوابوں کی راکھ گھول دی ہو۔جھیل کے آس پاس البتہ مستیوں کے ڈیرے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی۔سبز ڈھلوانوں پر شبنم کے قطرے جھلملا رہے تھے اور سرخ، جامنی اور زرد پھولوں کے جھرمٹ لہلہا رہے تھے۔اس وقت سرخ پھولوں کی بہتات تھی اور جھیل کے کنارے آتشِ گل سے دہک رہے تھے۔برفانی چوٹیوں پر کھیلتی ہوئیں کرنیں الگ جادو جگا رہی تھیں۔

فضاؤں میں پھیلی ہوئی جنگلی پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی مہک صدیوں کے راز سینے میں چھپائے بیٹھی تھی،صرف اُن پر ظاہر کرنے کے لیے جنھیں فطرت نے اپنی بارگاہ میں خود بلایا ہو۔

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج نے اپنی ساری روشنی جھیل کے کناروں پر بکھیر دی تھی، جھیل شاید اسی ناانصافی پر اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

سروٹ جھیل کے گدلے اور مٹیالے منظر نامے کی اصل کشش فطرت کی روح پرور سرگوشیاں تھیں، جنھیں کان نہیں سنتے ،دل سنتا ہے اور روح تک پہنچاتا ہے۔

یہ اعزاز کب کب نصیب ہوتا ہے کہ فطرت کے ساتھ وصال کے لمحات میں کوئی رقیب شریک نہ ہو اور فطرت گنگنا رہی ہو......سجنا ایہہ محفل اساں تیرے لئی سجائی اے۔

فطرت کی یہ عنایت دل نواز بھی تھی۔دل رُبا بھی۔اور باعث فخر بھی

سروٹ سر جو پہنچا تو اتنا کام ہوا
ذرا سی دیر کو فطرت سے ہم کلام ہوا
سدا بہار سا منظر، وصال کے لمحے
ہمارے واسطے کیا کیا نہ اہتمام ہوا

فطرت کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور لاتو بو میڈوز پر نظر ڈالی تو انکشاف ہوا کہ سنّی بستی کے قریب سے ایک پگڈنڈی اوپر آتی ہے۔نیچے کھڑے ہو کر یہ راستہ نظر نہیں آیا تھا، اس لیے چھلانگ پھلانگ کی نوبت آئی۔ندیم حسین ساتھ ہوتا تو کوئی دشواری نہ ہوتی۔

دوسرا بھید یہ کھلا کہ سروٹ سر کوئی مستقل فطرت کدہ نہیں ہے۔

یہ نانگا پربت سے اترنے والے گلیشیر میں بننے والی غیر معمولی وسیع جھیل ہے جو موسم کے مطابق بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔شاید اسی لیے جھیل کی تراش خراش اور بناوٹ بجھی بجھی لگتی ہے۔ البتہ اردگرد کا جوشِ بہار وقت اور موسم کے مطابق آتا جاتا رہتا ہے۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس لمحے فطرت کے ساتھ موسم کی عنایات بھی عروج پر تھیں۔

مجھ جیسے لوگ سُنّی بستی کی طرف سے آتے ہیں،جھیل کے کنارے کھڑے کھڑے دو چار تصویریں یا ایک آدھ سیلفی بنا کر واپس چلے جاتے ہیں۔مجاہد قاسمی صاحب کی طرح جھیل کنارے کی گل پوش پگڈنڈی پر چل کر ٹاپ میڈوز تک جانے کی زحمت کم ہی کرتے ہیں۔

شاید اسی لیے پھولوں کے قافلے پگڈنڈی کے بیچوں بیچ براجمان تھے۔

رنگِ گل سے گلشن میں آگ لگ رہی تھی اور بلبل کسی شجر کی ٹہنی پر بیٹھی پکار رہی تھی:

''صاحب پرے پرے''......مگر پرے پرے رہنے کی گنجائش کہاں تھی؟

صاحب بے چارے قدموں تلے بھڑکنے والی آتش گل بجھانے پر مجبور تھے۔

جھیل کی لمبائی کا تقریباً دو تہائی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اُس مقام تک پہنچے جہاں جھیل سے نکلنے والے نالے کے ساتھ ساتھ اُترتے ہوئے ٹاپ میڈوز تک پہنچنا تھا۔

قاسمی صاحب نے جھیل کے آخر تک جا کر تصویریں بنانے کا فیصلہ کیا۔میں نالے کے قریب پڑے ہوئے ایک ہموار پتھر پر بیٹھ کر جھرنے سے پھوٹنے والی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

یہ جبری لطف اندوزی کچھ زیادہ طویل ہوگئی تو قاسمی صاحب پر خواہ مخواہ غصہ آنے لگا کہ قدم قدم پر تصویر بنانے کے بعد کون سی کسر رہ گئی ہے جو کسی اور زاویے سے پوری ہو سکتی ہے؟

مجاہد قاسمی صاحب پر فوٹوگرافی سوار ہو جائے تو ٹریک اور وقت، دونوں کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔وہ جھیل کے دوسرے کنارے جا پہنچے اور دیر تک تصویریں بناتے رہے۔

پورا ایک گھنٹا ''ضائع'' کرنے کے بعد تشریف لائے اور پُرمسرت لہجے میں اطلاع دی:

''وہاں کوئی اچھی تصویر نہیں ملی ڈاکٹر جی۔بہت اچھا ہوا کہ آپ آگے نہیں گئے، ورنہ میری شامت آجاتی۔اب ذرا جلدی سے نیچے اتر چلیں۔ندیم حسین ٹاپ میدان تک پہنچ چکا ہوگا۔''

اب......دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں؟......جناب والا! وہاں کچھ نہیں ملا تو اپنی مایوسی اور حماقت کا اعتراف کیجیے۔اتنی مسرّت دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟

اور صرف مسرت......شاہین بھی ساتھ لے آتے تو کچھ اور بات ہوتی۔

جھیل سے واپسی کا یہ راستہ بھی اُتنا ہی پتھریلا تھا جتنا چڑھائی کا،مگر مُردہ دل نہیں تھا۔

جھرنے کے کنارے جنگلی گلاب پتھریلی فضا میں زندگی بن کر دھڑک رہے تھے۔

جگہ جگہ اُبھرتا سبزہ قلب ونظر کے لیے تازگی کا پیام لا رہا تھا۔

ایک جگہ سروٹ نالے پر کسی درخت کا نازک اندام تنا رکھ کر پل بنایا گیا تھا۔ میں نے سوچا ٹاپ میڈوز جانے کے لیے اس جگہ سے نالا عبور کرنا پڑتا ہوگا۔ مگر پل کی نزاکت دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

قاسمی صاحب فوٹوگرافی کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب پہنچے تو طنزیہ لہجے میں فرمایا:

''کیا ہوگیا ہے ڈاکٹر صاحب، بریک کیوں لگا لیے۔ میں تو سمجھا تھا کہ ہرلی کوفر بیس کیمپ پہنچنے سے پہلے دم نہیں لینے دیں گے۔''

''ارادہ تو یہی تھا مگر......'' میں نے نالے پر رکھے ہوئے تنے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ......ڈاکٹر جی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ اتنے چھوٹے چھوٹے ندی نالوں سے ڈرتے ہیں تو ٹریک پر آتے ہی کیوں ہیں؟''

''خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔'' میں نے خلوصِ دل سے اعتراف کیا۔

قاسمی صاحب نے پل پر قدم رکھا......اور......اڑ ڑڑ......غڑاپ

قاسمی صاحب نہیں گرے تھے، وہ چھوٹا سا پتھر لڑھک گیا تھا جس پر تنے کا سرا رکھا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ واردات پہلے ہی قدم پر ہوگئی۔ وہ نالے کے بیچ میں نہیں، کنارے پر پھسلے اور گرتے گرتے سنبھل گئے۔ میں نے بھی ذرا سی مدد کر دی۔ پھر کہا:

''سر جی، میں انھی حادثات سے ڈرتا ہوں۔ آپ نے خود کو سنبھال لیا۔ میں پانی کے ساتھ ''رُڑھ'' جاتا......کسی کے ہاتھ نہ آتا۔''

مجاہد قاسمی صاحب اُس نرم ونازک تنے کو گھورتے رہے جو بیچ سے ٹوٹ چکا تھا۔

''رہنے دیں سر، معاف کر دیں۔ اب اسے کچا چبائیں گے کیا؟'' میں نے کہا۔

''اس کا کوئی قصور نہیں۔ بے وقوفی ہماری ہے۔'' قاسمی صاحب نے اعتراف کیا۔

''ہماری نہیں صرف آپ کی۔ میں نے تو اس پر قدم ہی نہیں رکھا۔'' میں نے تصحیح کی۔

''مگر پل سمجھ کر عبور تو کرنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی پُل وُل نہیں ہے۔ مال مویشی ہانکنے والا ڈنڈا ہے۔ کسی نے بے خیالی میں نالے کے آر پار رکھ دیا ہوگا۔ اتنا کمزور ڈنڈا پل بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔'' قاسمی صاحب نے خیال آرائی کی۔

''یہ پل نہیں تھا تو پل ہے کہاں؟ ہم نالا کیسے عبور کریں گے؟'' میں تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔

''آپ کو کہا کس نے تھا کہ یہاں سے نالا عبور کرنا ہے؟ میں نے بھی دھیان نہیں دیا۔ یہ نالا سیدھا ٹاپ میڈوز تک جاتا ہے۔ وہاں پہنچیں گے تو کوئی نہ کوئی حل بھی نکل آئے گا۔ فی الحال اسی طرف چلتے رہیں، کوئی نیا پنگا نہ لیں۔''

ہم دوبارہ نالے کے اُسی کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سروٹ نالے نے ہماری کیفیت دیکھ کر راگ یمن کلیان چھیڑا......ایسا راگ جو میرے دل کی آواز بھی تھا:

موسم ہے عاشقانہ
اے دل کہیں سے ''پل'' کو
ایسے میں ڈھونڈ لانا

پل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ٹاپ میڈوز تک پہنچتے پہنچتے سروٹ نالے کا پاٹ چوڑا ہوگیا اور تہہ میں پڑے ہوئے پتھر صاف نظر آنے لگے۔ ہم ان پتھروں پر چل کر اُس پگڈنڈی تک پہنچ گئے جو ٹاپ میڈوز میں سے گزرتی ہوئی سمیل پہاڑی تک جا رہی تھی۔

گدھے بان بھائیوں سے عاجزانہ گزارش ہے کہ گدھے ہانکنے والے ڈنڈے ندی نالوں کے آر پار رکھ کر ہمارا امتحان نہ لیا کریں۔ آپ کے پہاڑی گدھے بے شک اتنے گدھے نہیں ہوتے کہ اِسے پل سمجھ کر عبور کرنے کی کوشش کریں......مگر میدانی گدھے......؟......اللہ معافی۔

ندیم حسین ٹاپ نالا میدان میں ہمارا منتظر تھا۔ اُس نے اپنا انداز نہیں بدلا۔ ہم قریب پہنچے تو ہیلو ہائے کے بعد گرم پانی کی بوتل قاسمی صاحب کے ہاتھ میں تھمائی اور گدھوں پر لادے گئے ایندھن کے گٹھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے چند منٹ رُکنے کے لیے کہا۔

''سر جی ہمارے جانوروں پر بوجھ لدا ہوا ہے، زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔''

''میں انھیں کھڑا نہیں رکھوں گا۔ سلامی دے کر فارغ کر دوں گا۔'' میں نے وعدہ کیا۔

میں نے گدھے کی لگام اپنے ہاتھ میں تھامی۔ نہایت احترام سے روپل ندی پر بنایا گیا پل عبور کروایا اور جوگر بجا کر زوردار سلیوٹ پیش کیا۔

گدھا ندیم حسین کا تھا، جواب دینے میں دیر کیوں لگا تا؟

گردن جھکا کر جوابی سلامی دی اور ڈھینچوں ڈھینچوں فرما کر دلی شکریہ ادا کیا۔

ندیم حسین کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پل عبور کر کے میرے قریب آیا اور گدھے کی لگام تھامتے ہوئے پوچھا:

''سر جی آپ نے ہمارے گدھے کو اس طرح سلیوٹ کیوں کیا ہے؟''

''اس کے بھائی بندوں نے گائیڈ بن کر ہمارا ٹریک پورا کروایا ہے۔سلامی دینا تو بنتا ہے۔''

''سر آپ کا ٹریک ہم نے پورا کروایا ہے۔'' ندیم حسین نے احتجاج کیا۔

''ایک ہی بات ہے۔میرا مطلب ہے گدھا آپ کا ہے تو ایک ہی بات ہوئی۔''

ندیم حسین کچھ دیر تک میرا لطیف سا طنز سمجھنے کی کوشش کرتا رہا،

پھر سر جھٹک کر گدھے کی پیٹھ پر چھڑی جمائی اور سمیل پہاڑی کی پگڈنڈی کا راستہ پکڑا۔

گدھے کا بار بار ذکر اگر طبعِ نازک پر گراں گزر رہا ہو تو ماحول اور صحبت کا اثر سمجھ کر معاف فرمایئے۔یا پھر بازن گلیشیر پر سے گزرتے ہوئے لاتوبو بیس کیمپ تشریف لے آیئے......خود بھی ......میرا مطلب ہے خود بخود معاف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ہم نے ٹاپ نالے کے کنارے دراز ہو کر بسکٹ اور جوس کا وقفہ کیا۔

ٹھنڈا ٹھار ماحول البتہ بھاپ اُڑاتے نوڈل سوپ یا گرما گرم کافی کا تقاضا کرتا تھا۔

ٹاپ میڈوز کے رنگین منظر نے ایک مرتبہ پھر احساس دلایا کہ یہاں سے سرسری انداز میں گزر جانا بہت بڑی حماقت ہے۔

نانگا پربت......روپل پیک......سمیل پہاڑی......شیگری پیک......اور ہمجولیاں

سبز مخمل کا فرش......رنگ برنگے پھولوں کا قالین......گیت گاتے جھرنے......خاموش جنگل

اتنی گوناں گوں رنگینیاں بہت کم مقامات پر نظر آتی ہیں۔

اس وقت ٹاپ میڈوز اُن روایتی چراگاہوں کا منظر پیش کر رہا تھا جو نسیم حجازی یا ایم۔اسلم کے تاریخی ناولوں میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ایسی افسانوی جگہ پر کم از کم ایک رات کے لیے خیمہ زن ہوئے بغیر ٹریک کا لطف ادھورا ہی رہتا ہے۔

اسی دوران ایک مقامی شخص چند بھیڑوں کے ساتھ پل عبور کرتا دکھائی دیا۔ہم نے سلام کے

بعد اُسے جوس اور بسکٹ کی دعوت دی۔اُس نے بلا تکلف قبول کر لی اور بسکٹ چباتے ہوئے پوچھا:

''صاب، آپ مازینو بھی گیا تھا؟''

''مازینو پاس صاب کے بس کا روگ نہیں۔صاب بس لاتوبو اور شیگری گیا تھا۔''

''ہم پاس کی بات نہیں کرتا۔مازینو بیس کیمپ کی بات کرتا ہے۔آپ پتا نہیں کتنا دور سے آیا ہے۔مازینو بیس کیمپ تک جانا بنتا تھا صاب۔''

''ہم اسلام آباد سے آیا ہے۔''

''آپ لوگ روز روز نہیں آئے گا ناں۔گورا لوگ ادھر آتا ہے تو مازینو بیس کیمپ تک ضرور جاتا ہے۔لاتوبو سے آگے ایک دن کا بات ہے۔ابھی دوسرا لوگ مازینو کے بارے میں بتائے گا تو آپ کو افسوس ہو گا کہ اُدھر تک کیوں نہیں گیا۔''

ٹریک سے واپسی پر جب میں نے تفصیلی مطالعہ کیا تو واقعی افسوس ہوا کہ مازینو بیس کیمپ تک کیوں نہیں گئے۔لاتوبو سے آگے پانچ یا چھ گھنٹے کا ٹریک چھوڑ کر واپس آنا؟

یہ صرف اپنے ساتھ نہیں، حسنِ فطرت کے ساتھ بھی زیادتی تھی۔

اس بارے میں ازابیل شا اور جان ماک سے معمولی سی لغزش سرزد ہوئی ہے۔

انھیں اس ٹریک کو ''نانگا پربت مازینو بیس کیمپ ٹریک'' کا نام دینا چاہیے تھا۔

اس ٹریک پر نانگا پربت کے تین بیس کیمپ آتے ہیں۔

پہلا بازن، دوسرا لاتوبو، تیسرا مازینو

شیگری میں ملنے والی ''پورٹریٹ'' نے مازینو پاس کی تجویز دی تھی۔

کاش اُس نے مازینو پاس کی بجائے نانگا پربت کے مازینو بیس کیمپ کا مشورہ دیا ہوتا۔

یا میں عقل سے کام لیتا اور اُس کے واضح اشارے سمجھ لیتا۔

دل چاہا، پلٹ کر لاتوبو میڈوز سے معافی مانگ لوں۔شاید اُسی نے مازینو کی راہ روک لی تھی۔

سمجھا ہو گا کہ ہم ابھی روپل فیس کے حسن کی انتہا دیکھنے کے قابل نہیں ہوئے۔

ٹھیک ہی سمجھا تھا......فطرت کے سارے راز نصیب اور ظرف پر ہی کھلتے ہیں۔

ٹاپ میڈوز سے آگے راستے اور مناظر دیکھے بھالے تھے اس لیے ہم بے فکر ہو کر سمیل پہاڑی کی پگڈنڈی پر بلندی کا سفر طے کرتے رہے۔

مجاہد قاسمی صاحب نے پگڈنڈی کے قریب اُگی ہوئی جھاڑی سے سفید رنگ کا پھول توڑ کر دونوں ہاتھوں سے مسلا اور میری ناک کے قریب کر دیا۔

پھول کی مسلی ہوئی پتیوں سے بھینی بھینی خوش بو اُٹھ رہی تھی۔

قاسمی صاحب نے بتایا کہ اسے ''امبری بوٹی'' کہتے ہیں اور یہ خوش بو دنیا کے معروف برانڈ ایمبر (AMBER) میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بوٹی گلگت بلتستان کے علاوہ آزاد کشمیر میں بھی کثرت سے ملتی ہے اور مقامی لوگ اسے عطر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس بوٹی کا جوہر تجارتی اور صنعتی پیمانے پر نکالا جا سکے تو اچھا خاصا زرِمبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد قاسمی صاحب نے ایک اور جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے پتے اور جڑیں موسمی بخار کے لیے اکسیر سمجھی جاتی ہیں۔

مجھے شک ہوا کہ شاید اُن پر بھی تھکن طاری ہے اور وہ مجھے جڑی بوٹیوں سے متعارف کروانے کے بہانے اپنے لیے آرام کے وقفے تلاش کر رہے ہیں۔

یہ شبہ مزید پختہ ہو گیا جب وہ ایک صنوبری جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گئے اور نانگا پربت کے برفانی چہرے پر مختلف شکلیں تلاش کرنے لگے۔ اُنھوں نے مختلف زاویوں سے اُڑتے ہوئے عقاب، گرجتے شیر اور آرام فرماتے ہوئے مگرمچھ کی تصویریں بھی بنائیں۔

بازن گلیشیر عبور کرتے ہوئے بھی انھوں نے فطری برق رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے کچھوے، ہاتھی اور ڈائنوسار کی شکل رکھنے والے پتھروں کی تصویریں بناتے رہے۔

ایک پتھریلا غار دکھائی دیا تو آرام کا غیر معمولی طویل وقفہ فرمایا۔

مجھے حیرانی ہوئی اور ذرا سی خوشی بھی

اچھا جی؟......قاسمی صاحب پر بھی تھکن کا حملہ ہو سکتا ہے؟

وہ بھی شوقِ تصویر کی آڑ میں راحت ڈھونڈتے ہیں؟

راحت ڈھونڈنا شاید ضروری ہو گیا تھا کیونکہ بازن گلیشیر ستم پر ستم ڈھائے چلا جا رہا تھا۔

آتے وقت ہم نے اِسے تقریباً ایک گھنٹے میں عبور کر لیا تھا

مگر اب ڈیڑھ گھنٹا بیت چکا تھا اور اختتامی چڑھائی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

آج شاید گدھے بھی چھٹی منا رہے تھے۔ ایک جگہ راستے سے بھٹک گئے تو سیدھی راہ پر

آنے کے لیے اُن کی لید کا سہارا لینا پڑا۔ اچھا خاصا طویل چکر کاٹنے کے بعد خدا خدا کر کے گلیشیر کی آخری چڑھائی نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور آرام کا طویل وقفہ کیا۔

چڑھائی کی آخری بلندی پر پہنچ کر ہم نے ہرلی کوفر بیس کیمپ کا منظر دیکھا۔ وہاں رنگ برنگے خیموں کی چھوٹی سی بستی آباد تھی اور غیر متوقع چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔

پتھریلی نشست پر ڈھیر ہو کر ہم نے اتھل پتھل سانسیں سنبھالیں۔

پھر ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اُترنا شروع کیا اور گرتے پڑتے بیس کیمپ تک پہنچے۔

فوٹو گرافی، مدھوبالا، شاعری، مزاح، فلسفہ......سب اپنی اپنی جگہ

مگر حضرتِ بازن صرف سانس اور ہمت کی قدر کرتے ہیں!

ندیم حسین نے ٹاپ پر ہماری جھلک دیکھتے ہی چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

چائے کے ساتھ گرما گرم چکن پکوڑے اور آلو کے تلے ہوئے قتلے بھی پیش کیے گئے تو اس کی ''آنیاں جانیاں'' بھول کر دلی شکریہ ادا کیا۔

ہرلی کوفر بیس کیمپ پر ایک جرمن گروپ خیمہ نشین تھا۔ اُن کے اراکین نانگا پربت کے سامنے قطار باندھے بیٹھے تھے اور اُن کی نظریں برفانی معبد کا طواف کر رہی تھیں۔

نانگا پربت ''جرمن پہاڑ'' کہلاتا ہے۔ اس لیے یہ منظر ایک دل چسپ امتزاج پیش کر رہا تھا۔

میں اُن کے قریب گیا اور گروپ فوٹو کی اجازت چاہی۔

ایک شخص نے انتہائی اُکھڑے ہوئے لہجے میں تصویر بنانے سے منع کر دیا۔

میں شرمندہ شرمندہ واپس پلٹنے لگا تو اُس نے تبصرہ بھی جڑ دیا:

''میں جانتا ہوں کہ تم گروپ فوٹو کے بہانے ہماری خواتین میں دلچسپی لے رہے ہو۔''

خواتین؟ کہاں تھیں خواتین؟

کرسیوں پر تفصیلی نگاہ دوڑائی تو انکشاف ہوا کہ اُن کے درمیان واقعی ایک مدھم سی خاتون تشریف فرما ہیں......اگرچہ وہ بہت زیادہ خاتون نہیں تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے انتہائی دھیمی آواز میں خود کلامی کی:

''میں اب اپنی ذاتی خاتون میں بھی دلچسپی لینے سے پہلے کئی بار سوچتا ہوں، تمھاری برائے نام خاتون میں ''کیا'' لوں گا؟''

میرا یہ جملہ غالباً اکھڑ مزاج شخص کے کانوں تک پہنچ گیا۔

اس نے تیکھی نظروں سے مجھے گھورا اور طنزیہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''پھر تم اس برائے نام خاتون کے گروپ فوٹو میں دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

اور میں؟......وہ محاورہ ہے نا......کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بس یہی کیفیت تھی میری

بھلا میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ اردو میں کی جانے والی خود کلامی اس نے سمجھ لی ہوگی۔

اس کا سوال انگریزی میں تھا، مگر یہ میری اردو طنز کا جواب دینے کے لیے کیا گیا تھا۔

وہ مضحکہ اُڑانے والی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا تو میں نے سنبھل کر جواب دیا:

''اس کی ایک نہیں، تین وجوہات ہیں جناب، سننا پسند فرمائیں گے؟''

''پہلی بتاؤ۔ پھر دیکھیں گے کہ باقی سنی جا سکتی ہیں یا نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''پہلی وجہ یہ ہے کہ نانگا پربت جرمن پہاڑ کہلاتا ہے۔ جرمن ٹریکرز عقیدت بھری نظروں سے اس کا دیدار کررہے ہیں۔ یہ امتزاج آپ کے گروپ فوٹو کے لیے ایک خوب صورت عنوان بن سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تصویر اور عنوان اپنی کتاب میں شامل کروں۔''

''تم رائٹر ہو؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''شوقیہ رائٹر ہوں، پیشہ ور نہیں۔''

''تمھاری کتابوں کا موضوع کیا ہے اور تم کرتے کیا ہو؟''

''ڈسٹرکٹ سرجن تھا۔ ریٹائرڈ ہوچکا ہوں۔ شمالی علاقوں کے چھ سات سفرنامے لکھے ہیں۔''

''اوہ۔ آئی ایم سوری، ریئلی سوری۔'' اُس کے لہجے میں نرمی بھی آئی اور تھوڑی سی جھجک بھی۔

''اِٹس آل رائٹ۔ لیکن ابھی دوسری اور تیسری وجہ باقی ہیں۔''

''اب ضرورت نہیں رہی۔ تم ہمارا گروپ فوٹو لے سکتے ہو۔''

''مگر میں دوسری اور تیسری وجہ بتانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ۔'' اُس نے احسان کیا۔

''میں تمھارا گروپ فوٹو اپنے فیس بک پیج پر اپ لوڈ کرکے مقامی سیّاحوں کو وادیِ روپل کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل نانگا پربت کا فیری میڈوز بیس کیمپ بہت مقبول ہے۔ اِس طرف کم لوگ آتے ہیں۔ غیرملکی سیّاحوں کی روپل فیس میں دلچسپی شاید اسے بھی اُتنا ہی مقبول بنا دے اور وادی کے

ذرائع آمدنی میں اضافہ ہوجائے۔ یہاں غربت نسبتاً زیادہ ہے۔''

''کیا تمھارا فیس بک پیج اتنا مقبول ہے کہ مقامی ٹریکرز اور سیّاحوں کو متوجہ کرسکے؟''

''بے شک نہیں ہے، مگر اپنی حد تک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

''تمھاری کوشش پُرخلوص ہوسکتی ہے، مگر ہم اُس وقت سے خوف زدہ ہیں جب یہ بیس کیمپ بھی فیری میڈوز کی طرح برباد ہوجائے گا اور نانگا پربت کے سارے چہرے بری طرح مسخ ہوکر رہ جائیں گے۔'' اُس نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب۔ فیری میڈوز کی وجہ سے نانگا پربت کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟''

میں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا۔ حالانکہ قاسمی صاحب کو خود بتا چکا تھا کہ ہورہا ہے۔

''ہم فیری میڈوز میں قیام کے بعد یہاں آئے ہیں۔ اُس وادی کا حسن بڑی بے رحمی سے برباد کیا گیا ہے۔ دیودار اور صنوبر کے درختوں کی جگہ چوبی عمارتوں کے جنگل اُگ آئے ہیں۔ اب وہ ایک خوب صورت بستی تو ہے، اُسے فیری میڈوز کہنا فطرت کے ساتھ مذاق کے مترادف ہے۔ اس جگہ بھی یہ مذاق کیا گیا تو فطرت کی دوشیزگی پر بہت بڑا ظلم ہوگا۔''

بات تو سچ تھی......مگر بات تھی رسوائی کی......جواب کیا دیتا؟

''اب تیسری وجہ بھی بتادو۔'' مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا۔

''تیسری وجہ تم لوگوں کے ساتھ بات چیت کرکے اپنے ملک کا سوفٹ امیج اُجاگر کرنا تھا، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم صرف ایک ٹن بیئر کا تحفہ دے کر کم از کم ہمارے گروپ کے سامنے اپنا سوفٹ امیج اُجاگر کرسکتے ہو۔'' گروپ کے ایک عمر رسیدہ شخص نے مسکراتے ہوئے فرمائش کی۔

''یہاں نہیں کرسکتا۔ اپنے شہر میں ہوتا تو ضرور کردیتا۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور اکتائے ہوئے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے بائی بائی ٹاٹا کرتا ہوا ''اپنے گدھوں'' کے قریب آ گیا۔

میں نے اُن کا گروپ فوٹو نہیں بنایا۔ یہ سوال بھی نہیں کیا کہ اس شخص نے اردو کیسے سمجھ لی۔

کتاب میں شامل کی جانے والی تصویر قاسمی صاحب نے انھیں ریڈی کہے بغیر بنائی تھی۔

زندگی کے بعض بھولے بسرے، معمولی واقعات برسوں بعد اپنی اصل اہمیت جتاتے ہیں۔

ٹریک کے بعد ایک بین الاقوامی جریدے کا آرٹیکل نظر سے گزرا۔ اس میں فیری میڈوز کی

تباہی پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ مصنف کا نام مائیکل بیک (MICHAEL BEEK) تھا۔

اُس کی تصویر دیکھ کر دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔

فیری میڈوز کا چاہنے والا وہی ''اکھڑ مزاج'' جرمن ٹریکر تھا جسے میں نے نہایت بے دلی سے ''بائی بائی ٹاٹا'' کہا تھا۔ تحریر پڑھتے ہوئے یاد آیا کہ میں اس کا نام پہلے بھی سن چکا تھا۔

مائیکل بیک کوئی عام سیاح نہیں، نانگا پربت اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیّاحت کے حوالے سے ''لونگ لیجنڈ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر کارل ماریا ہرلی کوفر کی قیادت میں نانگا پربت سر کرنے کے لیے آنے والی جرمن ٹیم کا رُکن تھا۔ انھوں نے اسی مقام پر خیمے لگائے تھے جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔

مہم کی ناکامی کے بعد مائیکل بیک نے گلگت بلتستان اور چترال کو اپنی سرگرمیوں کا مستقل مرکز بنالیا اور ۱۹۸۴ء میں ٹریکنگ اور سیّاحت کی منظم مہمات کا آغاز کیا۔

ہم غونڈوغورولا اور سنولیک کے زعم میں مبتلا تھے، وہ انھیں بارہا سر کر چکا تھا۔

نانگا پربت سرکٹ ٹریک کا آغاز اسی کی قیادت میں ہوا۔

یہ تین ہفتوں پر محیط پاکستان کا خوب صورت ترین ٹریک ہے جس میں نانگا پربت کے تینوں رُخ (دیامیر، روپل، فیری میڈوز) اور مازینو پاس سمیت کئی دشوار گذار درّے شامل ہیں۔

مائیکل بیک نے ۱۹۹۱ء میں ہمالیہ نیچر ٹور کے نام سے اپنی ٹریکنگ ایجنسی قائم کی اور ۱۹۹۶ء میں ''پاکستان گائیڈ......ملک......تاریخ......ثقافت'' کے نام سے جامع کتاب لکھی جو اسلام آباد سے خنجراب تک کے سفر کا منفرد سفرنامہ ہے۔ اس میں پاکستان کے قدرتی حسن، کوہ نوردی کے مواقع اور سیّاحتی سہولیات کا بہت خوب صورت احاطہ کیا گیا ہے۔

ہم جس شخص کے سامنے اپنے ملک کا ''سوفٹ امیج'' زبانی کلامی اُجاگر کرنا چاہتے تھے وہ اس سے کہیں بڑھ کر کام کر چکا تھا۔ اُس نے پاکستان کا سوفٹ امیج تصویری کتاب کے تقریباً ۲۵۰ صفحات پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔

مائیکل بیک کی ہمالیہ نیچر ٹور کمپنی کے زیرِ اہتمام درجنوں غیر ملکی گروپ پاکستان آتے ہیں اور اس کا دلکش رُخ تصویروں اور ویڈیوز کی شکل میں اپنے سوشل میڈیا پر اپلوڈ کرتے ہیں۔

فروغِ سیّاحت کے حوالے سے مائیکل بیک محسن پاکستان کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم اُسے اُکتائے ہوئے لہجے میں ''بائی بائی ٹاٹا'' کہہ کر لوٹ آئے۔

ہائے اوئے ربّا.........قربان جائیں اپنی لاعلمی، نالائقی اور نااہلی کے!

بیس کیمپ پر رنگینی اور غیر معمولی گہما گہمی دیکھ کر میں نے تجویز پیش کی کہ آج رات یہیں قیام کر لیا جائے۔ قاسمی صاحب متفق ہو گئے مگر ندیم حسین کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔

اُسے اچانک یاد آیا کہ آج کھیتوں میں پانی لگانے کی باری ہے اور اُس کا وقت پر گاؤں پہنچنا ضروری ہے۔ میں نے اُسے اضافی دن کا وعدہ یاد دلایا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا کہ ایسا کوئی وعدہ ہوا ہی نہیں تھا۔ بات بڑھتے بڑھتے تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ روپل کی ''سیّاح شکن'' روایت نبھانے کے لیے خیمہ بستی کے منتظم اور مقامی باشندے ندیم حسین کے ہم نوا بن گئے۔

ہمارے تھکن سے چور اعصاب میں بحث وتکرار کی طاقت ہی کہاں بچی تھی۔

چنانچہ ''مٹی پاؤ'' پالیسی اپنائی اور پلّے روپل کی طرف واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

جیپ سٹاپ پر کچھ دیر آرام کیا اور مغرب کی اذان کے وقت پلّے روپل پہنچ گئے۔

ندیم حسین فوراً ہی بھاپ اُڑاتا ہوا قہوہ لے آیا۔ ہمیں اُس کے رویّے سے گلے شکوے ضرور تھے، مگر روپل فیس بیس کیمپ ٹریک بخیر وخوبی اختتام کو پہنچا تو یہی مناسب سمجھا کہ تمام تلخیاں قہوے کی شیرینی میں گھول کر پی لی جائیں۔ اور آخر کر بھی کیا سکتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد ہم بستروں پر لیٹ چکے تھے کہ ندیم حسین کی آواز سنائی دی:

''سر جی، ترشنگ سے ایک جیپ والا سواریاں لے کر آیا ہے۔ آپ اگر جیپ لینا چاہتا ہے تو ہم اسے رُکنے کے لیے بول دے۔''

''رُکنے کے لیے بول دے کا کیا مطلب؟...... کیا وہ واپس ترشنگ جا رہا ہے؟'' قاسمی صاحب نے وضاحت چاہی۔

''جی سر۔ اُس کا گھر چورت میں ہے۔ اگر آپ جیپ نہیں لیتا تو وہ سیدھا اپنے گھر چلا جائے گا۔ اِدھر کس کے لیے رُکے گا؟''

''اگر وہ ابھی واپس جا رہا ہے تو ہمیں بھی ساتھ لے جائے اور سواری کے حساب سے کرایہ وصول کر لے۔ صبح تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ہم بات کرتا ہے سر۔'' ندیم حسین نے کہا اور باہر چلا گیا۔ پھر چند منٹ بعد واپس آ کر کہا۔

''جیپ والا سواری کے حساب سے جانے کے لیے تیار نہیں ہے سر۔ آپ کو سپیشل جیپ کروانا پڑے گا۔ ادھر سے ترشنگ کا کرایہ آٹھ ہزار روپے بنتا ہے۔ وہ بولتا ہے آپ لوگوں سے صرف چھ ہزار لے گا۔ آپ مہمان ہوتا ہے ناں۔''

''ہم سپیشل جیپ نہیں لیں گے تو وہ خالی گاڑی لے کر واپس چلا جائے گا؟ ایک ہزار روپے کمانا پسند نہیں کرے گا؟'' میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''نہیں کرتا ہے سر۔ وہ بولتا ہے کہ روپل کا لوگ ہوتا تو سواری کے حساب سے لے جاتا۔ ٹورسٹ لوگ کو لے کر نہیں جائے گا۔ اس طرح سارا روٹین خراب ہوتا ہے۔''

''یہ تو کھلی ہوئی بلیک میلنگ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور سپیشل جیپ لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تم لوگ ایک طرف ٹورسٹ کے لیے مہمان مہمان کی رٹ لگائے رکھتے ہو اور دوسری طرف مہمان کی جیب کاٹنے پر تلے رہتے ہو۔ یہ آخر کس قسم کی مہمان نوازی ہے۔''

''ہم کیا بول سکتا ہے سر۔ آپ جیسا مناسب سمجھتے ہو ویسا کر لو۔ آپ بولو تو ہم اُسے پانچ ہزار لگا دے۔ پانچ ہزار بالکل ٹھیک ہے ناں سر۔''

''یہاں سے ترشنگ تک کتنی دیر کا ٹریک ہے؟''

''ہمارا ڈیڑھ سے دو گھنٹا لگتا ہے۔ آپ لوگوں کو تین گھنٹا بھی لگ سکتا ہے اور صبح کے وقت بہت جلدی نکلنا پڑے گا۔ ترشنگ سے استور کے لیے جیپ صبح سویرے نکلتا ہے۔''

''ہم بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اگر سواری کے حساب سے جانا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ صبح سویرے پیدل نکلیں گے۔''

''دیکھ لیں سر۔ اذان سے پہلے نکلنا پڑے گا اور راستے میں گلیشیر بھی آتا ہے۔''

''آتے وقت کوئی گلیشیر نہیں آیا تھا۔ اب کہاں سے آجائے گا۔''

''آتے وقت ہم لوگ جیپ سے آیا تھا سر۔ پیدل راستے میں گلیشیر آتا ہے۔''

''ہم جیپ کے راستے سے چلے جائیں گے۔''

''جیپ کا راستہ بہت لمبا پڑتا ہے سر۔ چلتے چلتے دوپہر ہو جائے گا اور استور کا گاڑی نکل جائے گا۔ جیپ کا راستہ صرف جیپ کے لیے ہوتا ہے۔ پیدل لوگ نہیں چلتا۔''

''ٹھیک ہے۔ بلیک میل ہونے سے بہتر ہے کہ ہم ترشنگ تک پیدل ٹریک کر لیں۔''

قاسمی صاحب نے بات ختم کرتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ ندیم حسین ایک مرتبہ پھر باہر چلا گیا اور چند منٹ بعد واپس آ کر اطلاع دی:

''سر وہ چار ہزار پر رضامند ہو گیا ہے۔ اب آپ بولو، کیا کہتا ہے۔''

''ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ بات چار یا چھ ہزار کی نہیں اصول کی ہے۔ جیپ ڈرائیور سواری کے حساب سے لے جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ جہاں ہم نے دو دن ٹریک کیا ہے وہاں تیسرے دن بھی کر لیں گے۔'' میں نے قاسمی صاحب کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ پھر سوچ لو سر۔ پیدل جانا ہے تو صبح چار بجے نکلنا پڑے گا۔ اتنی جلدی ناشتا تیار نہیں ہو سکے گا۔'' ندیم حسین نے دبے لفظوں میں دھمکی دی۔

''کوئی بات نہیں۔ ناشتا اِن شاءاللہ ترشنگ کے روپل ریزورٹ میں کریں گے۔''

ندیم حسین کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ہمیں ترشنگ پہنچانا اُس کی ذمّےداری تھی۔

وہ اپنی ذمّےداری جیپ ڈرائیور کے حوالے کر کے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

اب اُسے بھی ناشتا کیے بغیر سامان کا بیگ شانوں پر لاد کر ترشنگ جانا تھا۔ مایوس کیوں نہ ہوتا؟

جیپ ڈرائیور نے روپل کی روایت توڑنا پسند نہیں کیا اور ہارن بجاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اُس کا رویّہ جیسا بھی ہو، بندہ اصول پسند تھا۔

ندیم حسین نے صبح ساڑھے تین بجے گرم پانی کا لوٹا پیش کر دیا۔

ہم نے ہاتھ منہ دھویا، سامان سمیٹا اور چار بجے پلّے روپل کی جنت نظیر بستی کو الوداع کہہ دیا۔

پلّے روپل سے ترشنگ تک مارننگ واک کرتے ہوئے ہم اسے اپنی ہی نازل کردہ مشقت سمجھ رہے تھے اور دل ہی دل میں پچھتا رہے تھے کہ صرف چار ہزار روپے کی خاطر نیند اور ناشتا قربان کرنے کی حماقت کیوں کی۔ جب تک رات کی تاریکی چھائی رہی یہ کیفیت بھی چھائی رہی۔

ہم اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سر جھکائے چلتے رہے۔

جوں جوں صبح کا اجالا پھیلتا گیا پچھتاوا شکرگزاری کے جذبات میں ڈھلتا گیا اور یوں محسوس ہوا کہ جیپ ڈرائیور کے ہاتھوں بلیک میل نہ ہونے کا فیصلہ فطرت کے اشارے پر ہوا تھا۔

ترشنگ سے پلّے روپل آتے وقت شام دھندلا گئی تھی اور مناظر چھپ چکے تھے۔

کل رات اگر جیپ کا فیصلہ کر لیا جاتا تو یہ سفر ایک بار پھر رات کی تاریکی میں ہوتا۔

فطرت چاہتی تھی کہ پلّے روپل سے ترشنگ تک کے مناظر اپنی پوری آب و تاب میں دکھائے جائیں۔اس مقصد کے لیے بہترین وقت یہی تھا۔

شاید فطرت کے اشارے پر ہی ہم اور جیپ ڈرائیور اپنی اپنی ضد پر اڑ گئے تھے۔

سورج کی کرنیں بائیں جانب نظر آنے والی نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں پر اترنے لگیں تو ہمارے قدموں میں بیڑیاں پڑنے لگیں......ایسا طلسم؟......ایسا سحر؟

سچ تو یہ ہے کہ ہم ٹریک کے ’’اضافی‘‘ مرحلے میں اتنے دلکش انعام کی توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن فطرت نے ہمیں ایک اور انعام سے بھی نوازا۔

یہ انعام روپل اور ترشنگ کو ملانے والے درّے کے ٹاپ پر سے گزرتے ہوئے نظر آیا

ترشنگ، چورِت اور رام نگر (اب رحمان نگر) کا وسیع، رنگین اور بے حد شاداب منظر نامہ

ہم کس کو دل ربا کہیں کس کو کہیں حسیں
روپل بھی پُرجمال ہے، ترشنگ بھی اک کمال

گولڈن آور میں فطرت کا جمال و کمال لمحوں کا مہمان ہوتا ہے۔

سورج ذرا سا بلند ہو جائے تو روشنی کا ڈرامائی تاثر ختم ہو جاتا ہے۔

ڈرامے سے لطف اندوز ہونے کے لیے ناشتے اور نیند جیسی راحتیں قربان کرنا پڑتی ہیں۔

جمال و کمال کی پہلی دشواری ’’چھنگ فر گلیشیر‘‘ کی صورت میں سامنے آئی۔

چھنگ فر کے لفظی معنی ’’چھت سے اترنے والا‘‘ ہیں۔

یہ گلیشیر نانگا پربت کی برف پوش چھتوں سے اترتا ہوا ترشنگ کے قریب پگھل کر روپل ندی میں شامل ہو جاتا ہے۔اسے ترشنگ گلیشیر بھی کہتے ہیں۔

اس کی چڑھائیاں اور اُترائیاں بازن جیسی ہی ہیں۔اس پر سے چند سال پہلے تک جیپ ٹریک گزرتا تھا، اس لیے پتھر قدرے ہموار ہو گئے ہیں اور پگڈنڈی نما راستہ بن گیا ہے۔

دوسری آسانی یہ ہے کہ چھنگ فر گلیشیر کی پوری چوڑائی کی بجائے صرف ’’بوتھی‘‘ یعنی اختتامی مورین پار کرنا پڑتی ہے۔یہ مرحلہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیتا۔

گلیشیر سے آگے ایک ڈھلوانی اترائی تھی۔دونوں جانب بید مجنوں اور سفیدے کے درخت اٹینشن کھڑے تھے۔ان درختوں کے محرابی جھکاؤ نے ترشنگ کے داخلی راستے کو ایک طرح کی

استقبالیہ راہداری میں بدل دیا تھا۔اس راہداری میں بید مجنوں اور سفیدے کی سلامی قبول کرتے ہوئے ہم پلّے روپل سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد ترشنگ کی آبادی میں داخل ہو گئے۔

جیپ ٹریک بننے کے بعد بہت کم ٹریکرز اور سیاح یہ راستہ پیدل طے کرتے ہیں۔میری ذاتی رائے ہے کہ آتے یا جاتے وقت ایک مرتبہ ضرور یہ تجربہ کرنا چاہیے۔ایک دانشور کا قول ہے:

’’انسان کا اصل گھر اُس کا مکان نہیں، راستے ہیں۔زندگی کا ہر راستہ پیدل طے کرنا چاہیے۔‘‘

ہمارا ارادہ تھا کہ ناشتا روپل ریزورٹ میں کریں گے۔

استور جانے والی جیپ روانگی کے لیے تیار نظر آئی تو یہ پروگرام منسوخ کر دیا۔

ندیم حسین کا حساب چکا کر ہم نے اُس سے الوداعی مصافحہ کیا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔

نانگا پربت روپل فیس بیس کیمپ آسان درجے کا بچکانا سا ٹریک ہے۔

اس کے اختتام پر تھکن سے چور ہونا شاید مبالغہ، یا مصنوعی ڈراما لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی ناقص منصوبہ بندی کا خمیازہ بھگتا۔

اتنے بے ضرر اور ننھے منّے ٹریک کو چودہ گھنٹے طویل مرحلے سے آلودہ کرنا ہماری غلطی تھی۔

ہمارا مقصد ہنگامی ویڈیو بنا کر یوٹیوب پر اپلوڈ کرنا نہیں تھا، وقت کی بھی کمی نہیں تھی۔

ٹریک کے دورانیے میں ایک دن کا اضافہ کر لیا جاتا، یا پہلے دن لاتوبو جھیل کا دیدار کرنے کے بعد لاتوبو پہنچتے، تو دوسرے دن کا ٹریک طویل نہ ہوتا اور ہم تھکاوٹ سے بے حال نہ ہوتے۔

ٹریک بھگتانے کی بجائے اگر فطرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونا مقصود ہو تو روپل فیس بیس کیمپ ٹریک کی مناسب آئٹینری کچھ یوں ترتیب دی جاسکتی ہے:

ٹریکنگ ٹیم اگر چھ تا آٹھ افراد پر مشتمل ہے اور اخراجات تقسیم ہو سکتے ہیں تو بہتر ہے کہ استور سے جیپ بک کروا کر صبح سویرے سفر شروع کیا جائے۔

اُن دنوں (۲۰۲۳ء) جیپ کا کرایہ بارہ سے پندرہ ہزار روپے تھا۔

استور سے ناشتا کر کے نکلیں تو ترشنگ کی فوٹوگرافی اور دوپہر کے کھانے کے بعد عصر سے پہلے جیپ ٹریک کے اختتام تک پہنچا جاسکتا ہے۔یہاں سے تقریباً پینتالیس منٹ کے فاصلے پر واقع ہرلی کوفر بیس کیمپ چائے سٹاپ، یا ایک رات قیام و طعام کے لیے بہترین انتخاب ہے۔

جیپ ڈرائیور ترشنگ پہنچنے سے پہلے پورٹرز یا باربرداری کے گدھوں کا انتظام کر سکتا ہے۔

یہ انتظام ترشنگ، روپل، جیپ سٹاپ یا ہرلی کوفر بیس کیمپ پر بھی ممکن ہے۔

اگلے روز ہرلی کوفر بیس کیمپ پر ناشتے کے دوران نانگا پربت کی چوٹیوں کا دیدار۔

یہ حسینائیں صبح سویرے تقریباً دس بجے تک بادلوں کے چنگل سے آزاد ہوتی ہیں۔

ان کی جلوہ گری دیکھ کر پرستار سوچتا رہ جاتا ہے کہ آگے جاؤں یا بس یونہی بیٹھا رہوں؟

جائے گا بھلا کیسے وہ لیلیٰ کی گلی میں
دیکھے گا تماشا جو تری جلوہ گری کا

مگر لیلیٰ کی گلی میں جانا واجب ہے۔اس لیے ناشتے کے بعد لاتوبو کے لیے روانگی

ٹاپ میڈوز میں لنچ کے وقفے کے بعد پورٹر یا گائیڈ کے مشورے سے لاتوبو جھیل یاترا

اور پھر لاتوبو بیس کیمپ تک ٹریک۔اپنا خیمہ نہ ہو تب بھی لاتوبو کی کسی بہک میں شب باشی کا انتظام ممکن ہے۔لاتوبو میں تعینات ٹورسٹ پولیس کے اکلوتے سپاہی نے ہمیں کھانے اور چوکی میں بستر لگانے کی دعوت دی تھی۔ہم نے اپنا خیمہ لگانا پسند کیا۔

اگلے روز ٹاپ نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جان ماک کے شگری یا مازینو بیس کیمپ تک فوٹوگرافک یا ویڈیوگرافک واک اور مازینو بیس کیمپ پر رات کا قیام

اگلے روز ناشتے کے بعد واپسی کا سفر شروع۔پروگرام ہو تو ٹاپ میڈوز میں شب باشی۔

اگلے روز جیپ سٹاپ پر واپسی جہاں ڈرائیور دیے گئے وقت کے مطابق انتظار کر رہا ہوگا۔

وقت اگر کم ہو تو لاتوبو یا ازابیل شا کی شگری ہی سے واپسی شروع کی جا سکتی ہے اور ٹاپ میڈوز میں پڑاؤ ڈالے بغیر مغرب یا عشاء کے وقت تک استور پہنچ سکتے ہیں۔

ہمیں استور پہنچتے پہنچتے ساڑھے نو بج سکتے تھے، کیونکہ صبح چھ بجے روانہ ہونے والی جیپ سواریاں سمیٹ کر ترشنگ کی آبادی سے باہر نکلی تو سات بج چکے تھے۔

سوال یہ تھا کہ اب اگلا پروگرام کیا ہوگا؟

ہم ایک ہفتے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور ابھی تین دن باقی تھے۔

ٹریک کے ہر مرحلے پر تذبذب کی کیفیت طاری رہی۔شوگر اور دل کے مسائل کی وجہ سے خدشہ تھا کہ شاید کسی چڑھائی پر ہمت جواب دے جائے اور ٹریک ادھورا چھوڑنا پڑے۔

اس بے یقینی کی وجہ سے باقی ماندہ دنوں کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہو سکی تھی۔

یہ حسن دل رُبا ہے ذرا آ کے دیکھیے

وادیِ پری شنگ......دادی کا چشمہ......منٹو کی شلوار......اللہ والی جھیل

وادیِ استور کے سیّاحتی مقامات کے بارے میں ہمارا علم ڈوئیاں چیک پوسٹ کے قریب لگائے گئے کتابی صورت کے رہنما بورڈ تک محدود تھا۔مختلف لوگوں سے سنی سنائی باتوں اور چند مقامی مشوروں کے مطابق وادیِ استور میں تفریحی سفر کے لیے تین مقامات پر غور کیا جا سکتا تھا۔

منی مرگ...... دِرلے جھیل......اور اللہ والی جھیل۔

ان تینوں کے بارے میں ہماری معلومات بالکل سطحی تھیں۔قاسمی صاحب نے اپنی قریبی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک مقامی شخص سے گفتگو شروع کی تو کچھ باتیں کھلنے لگیں۔

معلوم ہوا کہ منی مرگ میں داخلے کے لیے ایک روز پہلے جیپ بک کروانا اور صبح دس بجے تک چلم چوکی چیک پوسٹ پر پہنچنا شرط ہے۔اس کے بعد وادی میں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

دِرلے جھیل کے بارے میں اُس شخص کو زیادہ معلومات نہیں تھیں، صرف اتنا بتایا کہ راستہ بہت خراب ہے اور وہاں جانے کے لیے فور بائے فور جیپ ضروری ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بات درست نہیں تھی۔دِرلے جھیل کے لیے عام ٹیکسی بھی مل جاتی ہے۔تین سے چار گھنٹے کے اس سفر کے لیے صبح سویرے روانہ ہونا بہتر ہے تاکہ شام تک واپسی ممکن ہو سکے۔یہ جھیل کیونکہ شونٹھر پاس کے راستے میں آتی ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ استور جانے کی بجائے گوری کوٹ میں اتر کر جیپ کا بندوبست کر لیا جائے۔

اللہ والی جھیل کے بارے میں اُس کا کہنا تھا کہ استور سے بائیس کلومیٹر فاصلے پر ہے۔وہاں کے لیے بھی جیپ بہتر ہے، مگر گاڑی اچھی اور ڈرائیور باہمت ہو تو کار پر جانے کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔قاسمی صاحب نے فوٹوگرافی کے حوالے سے اللہ والی جھیل اور دِرلے جھیل کا تقابلی جائزہ چاہا تو اُس شخص نے اللہ والی جھیل کو بہتر قرار دیا۔اُس کا کہنا تھا کہ اس جھیل کے راستے میں بے شمار دلکش مقامات اور پکچر پوائنٹ ملتے ہیں۔دِرلے جھیل اصل میں شونٹھر نالے کا پھیلا ہوا حصہ ہے جس نے جھیل کا بھیس بدل رکھا ہے۔

سرسبزی اور شادابی کے لحاظ سے بھی اللہ والی جھیل کا سفر زیادہ دل آویز ہے۔

ان معلومات کے بعد دل آویز مناظر کے لیے اللہ والی جھیل

اور باہمت ڈرائیور کے طور پر نصرت دین ہمارا فطری انتخاب بن گئے۔

نصرت دین نے راما جھیل ٹریک پر ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ہم نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ آج اللہ والی جھیل کی زیارت کر آتے ہیں۔ جھیل سے واپسی کے بعد منی مرگ کے لیے جیپ کا بندوبست کریں گے اور کل صبح دس بجے سے پہلے چلم چوکی پہنچ جائیں گے۔

گوری کوٹ میں چائے کے وقفے کے دوران ہم نے موبائل پر نصرت دین سے رابطہ کیا۔

ہمارا پروگرام سن کر اُس نے ایک فراخدلانہ پیش کش کر دی۔

''سر آپ یاماہا ہنڈرڈ چلا لے گا؟'' اُس نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''بالکل چلا لوں گا۔ یہ میرا پسندیدہ بائیک ہے۔ مگر یاماہا ہنڈرڈ کہاں سے آئے گا؟''

''ہمارے کزن کے پاس سے آئے گا سر۔ ہم ایک دن کے لیے مانگ لے گا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتے۔''

''ہمیں تھوڑا سا کام ہے سر۔ آپ بائیک پر نہیں جا سکتا تو ہم ٹائم نکالے گا۔''

''آپ استور ہی میں ہیں ناں۔''

''ابھی ہم اپنے گاؤں میں ہے مگر استور کے لیے نکلنے والا ہے۔ آپ ہوٹل پہنچ کر فون کرو۔ ہم آپ کے پاس پہنچ جائے گا اور جیسا بولو گے ویسا کر لے گا۔''

''ٹھیک ہے نصرت دین، بہت شکریہ۔''

گوری کوٹ میں چائے کا وقفہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا تھا۔

ڈرائیور نے اس کی تلافی کے لیے ''شوٹم شوٹ'' کا مظاہرہ کیا اور ساڑھے نو بجے کے قریب روپل ہوٹل کے سامنے پہنچ کر بریک لگائی۔

ہمیں اس ہوٹل سے اپنے بیگ اُٹھانے تھے اور عبدالرؤف سے ملاقات کر کے کچھ گلے شکوے کرنے تھے۔ مگر عبدالرؤف ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ اس لیے دل کی دل ہی میں رہی۔

اُس کے لیے شکریے کا غائبانہ پیغام دے دیا گیا۔

ٹریک کا انتظام بہرحال اُسی نے کیا تھا۔

جیپ سٹاپ پر پہنچنے کے بعد نصرت دین کو فون کیا۔ اس نے مدینہ گرین ہوٹل پہنچ کر ہمارا استقبال کیا اور اللہ والی جھیل کے لیے ایک مرتبہ پھر بائیک فراہم کرنے کی پیش کش کی۔

یہ پیش کش بہت پرکشش تھی۔ بائیک ٹور کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ میں وادیِ نیلم کے تجربے کی وجہ سے پہاڑی راستے پر موٹر سائیکل چلانے سے گریز کر رہا تھا۔ نصرت دین کی پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ اپنی گاڑی میں جھیل کی زیارت کروا لائے۔

''سر ہمیں اپنے گاؤں میں ضروری کام ہے اس لیے تھوڑا دیر لگ جائے گا۔''

''ہمیں بھی تھوڑی سی دیر لگے گی۔ ہم نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔''

''ہم گاؤں سے ہو کر واپس آتا ہے تو دیر ہو جائے گا اور جھیل کے لیے بہت کم وقت بچے گا۔ آپ ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہے تو ابھی نکل چلو۔ جھیل کا راستہ ہمارے گاؤں سے گزرتا ہے۔ ہمیں اُدھر پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ جھیل کے راستے میں ہم کسی جگہ گاڑی روک کر انجن ٹھنڈا کرے گا۔ آپ ناشتا کر لینا۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی نکل چلتے ہیں۔ کرایہ کتنا لو گے؟''

''آپ سے کرائے کی بات نہیں ہوگی سر۔ جو خوشی سے دو گے رکھ لیں گے۔''

''اللہ والی جھیل کے لیے کرایہ چل کیا رہا ہے؟'' قاسمی صاحب نے پوچھا۔

''سات سے آٹھ ہزار چل رہا ہے سر۔ سڑک خراب ہونے کی وجہ سے کوئی بھی اُدھر نہیں جاتا۔ مگر آپ کے ساتھ دوستی ہو گیا ہے۔ ہم چلے گا اور جو خوشی سے دو گے رکھ لے گا۔''

''پانچ ہزار خوشی سے رکھ لو گے؟ ہمارے پاس بجٹ کم ہے۔ ابھی منی مرگ بھی جانا ہے۔''

نصرت دین کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ چند لمحوں کے لیے دھیمی پڑ گئی۔

ہمیں لگا وہ انکار کرے گا، مگر اُس کے جواب نے شرمندہ کر دیا۔

''سر بجٹ کم ہے تو کچھ بھی نہ دینا۔ ہم سمجھے گا مہمان دوست کا خدمت کر دیا ہے۔ آپ گاڑی میں بیٹھو اور اِدھر اُدھر سے نکلنے والی بات کرو۔ ہم آپ کا مزاج سمجھ گیا ہے۔ جھیل پر روشنی نہیں ملتا تو اچھا تصویر نہیں بنے گا۔ آپ کو بالکل مزہ نہیں آئے گا۔''

نصرت دین ہمارا مزاج سمجھ گیا تھا۔ ہم اُس کا مزاج نہیں سمجھ پائے تھے۔

نصرت دین کی مصروفیت دراصل بےلوث سماجی خدمت تھی۔

اُس نے استور بازار سے چند اشیائے ضرورت خریدیں اور اپنے گاؤں ''لوس داس'' کے مختلف گھروں تک پہنچائیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ خدمت بلا معاوضہ سرانجام دی گئی ہے۔

وہ صبح ٹیکسی لے کر استور کے لیے نکلتا ہے تو دوست احباب سامان کی پرچی اور قیمت اُس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ واپس جاتے وقت سامان ساتھ لے جاتا ہے۔ آج دوپہر کے وقت چکن پہنچنا ضروری تھا کیونکہ کسی پڑوسی کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔

سماجی خدمت نمٹاتے ہی نصرت دین نے گاڑی کا رُخ اللہ والی جھیل کی طرف موڑ دیا۔

سفر کا آغاز ایک تنگ وادی میں پختہ سڑک پر ہوا۔

ہمارے دائیں جانب ایک ندی اور ندی کے اس پار چٹیل مگر سبزی مائل بلندیاں تھیں۔

اور بائیں جانب ہوپک، شگرت، ڈچے اور کھنگرول نامی چھوٹی چھوٹی بستیاں۔

سفر کے آغاز میں سڑک کی حالت کافی بہتر تھی اور نصرت دین تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

خوب صورت مناظر فوٹوگرافی کے لیے پکار رہے تھے۔

ہم نصرت دین سے گاڑی روکنے کی درخواست کرتے

مگر بریک پیڈل دبنے سے پہلے مطلوبہ منظر گزر چکا ہوتا۔

کھنگرول سے آگے پختہ سڑک اختتام کو پہنچی اور نصرت دین کی تیز رفتاری کو بریک لگ گئے۔

استور سے دس کلومیٹر فاصلے پر واقع رام کھہ نامی بستی کے قریب ناشتا سٹاپ ہوا۔

رام کھہ یا ''رام کھا'' میں رام نے پتا نہیں کچھ کھایا ہوگا یا نہیں، ہم نے دال چاول کھائے۔

ایک مختصر سے دھواں زار کمرے پر مشتمل اللہ والی جھیل کے راستے کا اکلوتا ہوٹل کھانا ہی مہیّا نہیں کرتا، مقامی ثقافت و معاشرت کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔

ہوٹل کے آدھے سے زیادہ حصّے میں بنائے گئے چبوترے پر بوسیدہ سا قالین بچھا ہوا تھا اور آٹھ دس بزرگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایک گوشے میں لڈّو کی اور دوسرے میں تاش کی بازی چل رہی تھی۔

ہم کھانا کھا چکے تو انھوں نے دونوں بازیاں روک کر ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنی وادی کے بارے میں ہمارے تاثرات جاننے کے لیے سوالات کیے۔

ہم نے منظرنامے کی دل کھول کر تعریف کی تو حاضرین کے چہرے کھل اُٹھے۔

انھوں نے ہمارے کھانے کا بل ادا کرنے کے لیے بھی اصرار کیا۔

اللہ والی جھیل ایک مستند سیّاحتی مقام بن چکا ہے۔

اس کاروباری راستے میں اتنی پُرخلوص مہمان نوازی توقع کے خلاف تھی۔

ہم نے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور خوش گوار تاثّر کے ساتھ رام کھہ کی بستی کو الوداع کہا۔

رام کھہ سے آگے وادی کا دامن کشادہ ہونے لگتا ہے۔ سڑک اور ندی کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ ندی سے آگے سبزہ زار اور سبزہ زاروں میں رنگا رنگ بستیاں

ہم سمجھتے تھے کہ بستیاں فطرت کا حسن بگاڑتی ہیں۔ یہ شاید پہلی وادی دیکھی جس کی بستیاں فطری مناظر کا حسن بڑھا رہی تھیں...... ہمیں اتنے دلکش مناظر کی توقع نہیں تھی۔

ہمارا خیال تھا کہ ٹریک کی سب رعنائیاں سمیٹی جا چکی ہیں۔ یہ سفر تو بس ایک ''جھونگا'' ہے۔

ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سفر کی واحد کشش اللہ والی جھیل ہے جسے عالمی شہرت حاصل نہیں، اسے صرف مقامی ٹریکر یا وی لاگر ہی لفٹ کرواتے ہیں...... یا پھر ہم جیسے وقت گزارے!

مگر اللہ والی جھیل کے راستے ہماری سب غلط فہمیاں دور کر رہے تھے:

تم جسے کچھ نہیں سمجھتے تھے
رشکِ دنیا ہے تم یقیں مانو

رام کھہ سے تقریباً دو کلومیٹر آگے نصرت دین نے گاڑی روکی اور کہا:

''سر اجازت دو تو ہم اپنے کزن کو بھی گاڑی میں بٹھا لے۔''

''تمھارا کزن یہاں کیسے پہنچے گا؟'' قاسمی صاحب نے سوال کیا۔

''نیچے اُس کا گاؤں ہے ناں۔ پانچ منٹ میں آجائے گا۔ اُسے علاقے کے بارے میں بہت زیادہ معلومات ہے۔ وہ آپ کو گائیڈ کرے گا۔''

''اللہ والی جھیل کے لیے بھی گائیڈ کی ضرورت پڑے گی؟ تمھیں جھیل کا راستہ نہیں آتا؟''

''جھیل کا راستہ بالکل سیدھا ہے سر مگر علاقے کے بارے میں اور معلومات بھی ہوتا ہے۔ اسے اُن جگہوں کا پتا ہے جہاں سے جھیل کا تصویر اچھا آتا ہے۔ آپ لوگ فوٹوگرافی کرنا ہم اُس کے ساتھ گپ شپ کرے گا۔ اس طرح ہمارا دل بھی لگا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے بلا لو۔''

''ہم نے اُسے رام کھہ سے فون کر دیا تھا۔ وہ بولتا تھا کہ آپ لوگ شاید اُس کی کمپنی پسند نہ کرو۔ ہمیں پتا تھا کہ آپ اجازت دے دو گے۔ اس لیے آنے کا بول دیا تھا۔ بس آرہا ہو گا۔''

نصرت دین نے جس گاؤں کے قریب گاڑی روکی وہ ایک خوب صورت پکچر پوائنٹ تھا۔
ہم نے گاؤں کی تصویریں بنائیں۔

نصرت دین کا کزن آ گیا تو قاسمی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اُس کا انٹرویو لیا۔

''آپ کا نام کیا ہے اور آپ کیا کرتے ہیں۔''

''ہمارا نام رضوان اللہ راش ہے اور ہم سیکنڈ ایئر میں پڑھتے ہیں۔''

''آپ کے گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''ہمارے گاؤں کا نام مُشکے ہے۔''

''مشکے؟ یہ کیا نام ہوا؟ تمھارا گاؤں مُشک مارتا ہے؟'' (مُشک مارنا = بدبو آنا)

''مُشکے اس علاقے کا بہت مشہور گاؤں ہے سر۔ اس لیے کہ اِدھر دادی کا چشمہ ہے اور دلھا دلھن گلیشیر ہے۔ لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتا ہے۔''

''دادی کا چشمہ؟ کس کی دادی کا چشمہ؟''

''ہمارے والد شریف کی دادی کا۔ ہمارا پردادا دیوسائی میں رہنے والی پری کے ساتھ شادی بنا کر اُسے گاؤں میں لے آیا تھا۔ گاؤں میں پانی کا کمی تھا۔ پری دادی نے اپنے جادو کے زور سے ہمارے گاؤں میں میٹھے پانی کا چشمہ نکال دیا۔ اس لیے ہم لوگ اُسے دادی کا چشمہ بولتا ہے۔''

''تمھارے دادا کا نام کیا تھا اور پری اُن کے ہتھے کیسے چڑھ گئی؟''

''آسانی سے نہیں چڑھا تھا ناں۔ دادا شریف نے بکرے کی بھُنی ہوئی ران سے مار مار کر قابو کیا تھا۔ اس لیے جیسے ہی موقع ملا وہ اِدھر سے چلا گیا۔ آپ لوگ ابھی ہنستا ہے۔ مگر ہمارے علاقے میں یودئیں دادا اور پری دادی کا قصہ سب لوگ جانتا ہے۔''

''یودئیں کیسا نام ہے۔ آپ کے دادا کا تعلق کس مذہب سے تھا؟''

''دادا شریف پکا مسلمان تھا سر۔ وہ دیوسائی میں ہر سال چلّہ کاٹتا تھا۔ ایک چلے میں اُس نے دیوسائی کی پری کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ پری دادی کا کہانی کتاب میں بھی لکھا ہے۔''

''کون سی کتاب میں لکھی ہے؟''

''نام اس وقت یاد نہیں آرہا مگر کتاب ہم نے خود پڑھا ہے۔ اُس میں استور ویلی کے بارے میں سب معلومات لکھا ہوا ہے۔''

''وہ پری آپ کا گاؤں اور اپنا نکالا ہوا چشمہ چھوڑ کر واپس کیوں چلی گئی؟''

''دادا شریف نے اُس کے بالوں میں گانٹھیں لگا کر زبردستی اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا ناں۔ پری کو موقع ملا تو اُس نے اپنی بیٹی سے بال کھلوائے اور اُڑ گیا۔''

''تم دیوسائی کی پری کے پڑپوتے ہو۔ شاید اسی لیے تمھارے چہرے میں پریوں جیسی نزاکت جھلکتی ہے۔'' قاسمی صاحب نے اُس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''آپ کے علاقے میں پری کے چہرے پر مونچھ ہوتا ہے جناب؟'' رضوان اللہ راش نے انتہائی معصومانہ لہجے میں سوال کیا۔

پتا نہیں یہ سوال تھا یا ناگواری کا اظہار، قاسمی صاحب محتاط ہو گئے۔

''ہمارا والد شریف بولتا ہے کہ یودئیں دادا نے پری دادی سے تیسرا شادی بنایا تھا۔ ہمارا والد شریف اور ہم پہلی دادی کی اولاد میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے چہرے میں پریوں جیسا نزاکت نہیں جھلک سکتا۔ آپ ہمارا مذاق بناتا ہے۔ یہ اچھا بات نہیں ہے۔''

''اوکے۔ ویری سوری۔ اب دلھا دلھن گلیشیر کے بارے میں بتاؤ۔''

''وہ بھی ہمارے گاؤں میں ہے۔ لوگ دور دور سے دیکھنے آتا ہے۔ ہمارا والد شریف بولتا ہے کہ اُدھر سے ایک بارات گزر رہا تھا۔ کسی بزرگ کی بددعا نے دلھا اور دلھن کو برف میں تبدیل کر دیا۔ سب لوگ اُس برف کو دلھا دلھن گلیشیر بولتے ہیں۔ ابھی جھیل سے واپسی پر ہمارے پاس ٹھہرو۔ کل اُدھر چلتا ہے اور آپ کو برف سے بنا ہوا دلھا دلھن دکھاتا ہے۔''

''کل اُدھر نہیں چلتا۔ منی مرگ چلتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو دادی کا چشمہ اور دلھا دلھن دیکھنے پھر کبھی آئیں گے۔''

پری کو بکری کی ران سے مار مار کر قابو کرنے کی کہانی میں نے چلاس میں بھی سنی تھی۔
یہ شاید بلتی زبان کی لوک داستانوں کا حصہ ہے اور کئی علاقوں میں سنائی جاتی ہے۔

''نصرت دین بتا رہا تھا کہ تمھیں ایسے مقامات کا پتا ہے جہاں سے تصویریں بہت اچھی آتی ہیں۔'' میں نے رضوان اللہ راش سے تصدیق چاہی۔

''بالکل پتا ہے سر۔ ہمیں تصویر بنانے کا بہت شوق ہے۔''

''اور تم وہ مقامات دکھانے کی بجائے دادی کے چشمے کی کہانی سنا رہے ہو۔''

''وہ سامنے موڑ نظر آتا ہے ناں۔ ہم لوگ اُسے بورو موڑ بولتا ہے۔ اُدھر سے ہمارے گاؤں اور مشکے سورین کا تصویر بناؤ۔ بڑا زبردست فوٹو بنتا ہے۔''

ہم نے اُس کے مشورے پر عمل کیا اور بورو موڑ کے قریب گاڑی رکوا کر مشکے اور اُس کے جڑواں گاؤں مشکے سورین کی تصویریں بنائیں۔ منظر واقعی بہت اچھا تھا۔

''سر جی، اب بتاؤ ہمارا گاؤں کیسا ہے؟'' رضوان اللہ راش نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔

قاسمی صاحب نے مشکے کے حسن کا اعتراف نیم مزاحیہ اور نیم شاعرانہ ترنگ میں کیا:

لمڈے تیرا گاؤں بڑا پیارا...... میں تو گیا مارا...... آ کے یہاں رے

رضوان اللہ راش لمڈے کے معنی اور تہذیبی پس منظر سے آگاہ نہیں تھا ورنہ مجاہد قاسمی صاحب اُس کے ہاتھوں کرچ کرچ ہو جاتے اور دلھا دلھن گلیشیر کے ساتھ ''باباجی کا پتھر'' بھی لگا دیا جاتا۔

اس قسم کی عامیانہ فقرے بازی قاسمی صاحب کے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔

نہ جانے اُن پر کون سا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے پری دادی کا کوئی پرانا بوائے فرینڈ ہو۔

''رضوان صاحب آپ کے گاؤں کا نام مشکے ہے اور اس کے ساتھ مشکے سورین...... ساتھ والے گاؤں کے لیے کوئی الگ نام نہیں ملا؟'' میں نے اُس کی توجہ بٹانے کے لیے سوال کیا۔

''اصل میں سورین ہم اُس جگہ کو بولتے ہیں جہاں سورج جلدی نکلتا ہے، دیر میں غروب ہوتا ہے اور سر کے اوپر بہت دیر تک چمکتا رہتا ہے۔ اس جگہ ایسا ہوتا ہے اس لیے ہم اسے مشکے سورین بولتے ہیں۔ اِدھر کا سارا گھر بھی ہمارے گاؤں میں شامل ہے۔''

''اور اس دریا کو بھی سورین بولتے ہیں؟'' میں نے مشکے سورین کے قریب بہتے ہوئے پہاڑی نالے کی طرف اشارہ کیا۔ نالے کے عین اوپر سورج چمک رہا تھا اور جھلمل کرتے پانی سورین کی عملی تصویر پیش کر رہے تھے۔

''نہیں سر۔ اسے پری شنگ گاہ یا پری شنگ سین بولتے ہیں۔ سَین کا مطلب ہماری زبان میں دریا ہوتا ہے۔ یہ دریا اللہ والی جھیل سے آتا ہے اور لوس کے قریب دریائے استور میں شامل ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ اسے پری شنگ ندی کہہ سکتے ہو۔''

''پری شنگ ندی...... کہیں اس کا نام بھی آپ کی اُسی پری دادی کی وجہ سے تو نہیں رکھا گیا؟'' میں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''آپ پھر مذاق کرتا ہے سر۔ پری شنگ ہماری ویلی کا نام ہے۔ اس کا پہلا گاؤں لوس ہے۔ یہ نصرت اُدھر ہی رہتا ہے۔ لوس سے اللہ والی جھیل تک کا دس بارہ بستی پری شنگ ویلی میں آتا ہے۔''

''تمھیں سب بستیوں کے نام آتے ہیں؟''

رضوان اللہ راش نے ایک ہی سانس میں بستیوں کے نام ترتیب کے ساتھ اس طرح گنوائے جیسے کوئی طالب علم ''دو اِکم دو...... دو دونی چار'' کی طرح پہاڑا سنا رہا ہو۔

لوس...... شگرت...... ہوپک...... ڈچے...... کھنگرول...... رام کھہ...... مشکے...... سورین ......

چک...... تھینگ پائیں...... تھینگ بالا...... گوٹم سر...... ٹھیک ہو گیا سر

چک بھی ایک خوب صورت قصبہ ہے۔ مگر وادیِ پری شنگ کا اصل تحفہ تھینگ پائیں ہے۔

میں نے شمالی علاقوں کے سب گاؤں نہیں دیکھے اس لیے یہ بیان جاری نہیں کر سکتا کہ تھینگ پائیں پاکستان کا حسین ترین گاؤں ہے۔

یہ بات البتہ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تھینگ پائیں سے زیادہ ''شاہکار'' بستی آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ اس بستی میں فطرت کی مصوّری اپنے عروج پر ہے۔

یہ گاؤں ایک سرسبز و شاداب جزیرے نما ٹاپو پر بسایا گیا ہے۔

اس پر سایہ فگن بلندیوں اور اللہ والی جھیل سے آنے والے پانی جزیرے کا طواف کرتے ہیں اور اسے ایک منفرد منظر بنا دیتے ہیں۔ پس منظر میں نانگا پربت کی برف پوش چوٹیاں ہیں۔

تھینگ پائیں نانگا پربت کا بہترین ویو پوائنٹ ہے۔

آٹھ ہزاری چوٹی اگر کسی بستی کا پس منظر بنائے تو بستی کا حسن دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

تھینگ پائیں میں مصوّری اور تصویر کشی کا یہ قانون الٹ جاتا ہے۔

یہ فطرت کدہ پیش منظر بن کر نانگا پربت کے جمال میں دلکش رنگ بھرتا ہے۔

قاسمی صاحب نے فطرت کی روح پرور عنایات دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا:

''یہاں بہت زیادہ آفت اُتری ہوئی ہے ڈاکٹر جی۔ فریم بنانے کی ضرورت ہی نہیں، شٹر بٹن دباتے جائیں۔ تصویریں خود بخود بنتی جائیں گی۔''

"آفت؟......آپ کو ہماری بستی میں کون سی آفت نظر آتی ہے؟" قاسمی صاحب کے پیچھے کھڑے ہوئے مقامی باشندے نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔

قاسمی صاحب اس اچانک دخل اندازی پر بوکھلا گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔ ان کا مطلب ہے آپ کی بستی بہت خوب صورت ہے۔" میں نے قاسمی صاحب کی ترجمانی کی۔

"خوب صورتی کو آفت کون کہتا ہے؟" ناگواری میں تھوڑا سا جلال بھی شامل ہو گیا۔

"یہ بہت زیادہ گھومے ہوئے ہیں اس لیے سوچے سمجھے بغیر بول جاتے ہیں۔ آپ کو بُرا لگا ہے تو ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

"معذرت کی ضرورت نہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اگر اصل خوب صورتی دیکھنا چاہتے ہیں تو تھوڑا آگے جائیں۔"

"آگے ہی جا رہے ہیں۔ اللہ والی جھیل کی طرف۔"

"جھیل کی طرف نہیں، ہمارے گاؤں سے آگے اُس طرف جاؤ اور کشرونیرل دیکھو۔" اُس نے ایک بلندی کی طرف اشارہ کیا۔

"کشرونیرل کیا چیز ہے؟"

"اِدھر ہمارے گاؤں کا جانور گھاس چرتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے وہاں تھوڑا سا گھر اور مسجد بھی بنایا ہوا ہے۔ چٹان کاٹ کر بنایا گیا مسجد دیکھنے والا چیز ہے۔ اُدھر تینگلی اور موکھیلی چوٹی بھی ہے اور سوجوسر اور بڑوسر جھیل بھی۔ ٹورسٹ لوگ بڑوسر کو سٹار لیک بولتا ہے۔"

"آپ جس میڈوز اور مسجد کی بات کر رہے ہیں وہ یہاں سے کتنی دور ہے اور جھیلوں تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"نو دس کلومیٹر ہوگا۔ ہمیں تین گھنٹا لگ جاتا ہے۔"

"نو کلومیٹر تین گھنٹے میں......یعنی اچھی خاصی چڑھائی ہے اور راستہ آسان نہیں ہے۔"

"راستہ بالکل آسان اور سیدھا ہے۔ ہمارا بھیڑ بکری اور بڑا جانور آرام سے جاتا ہے۔"

"ہم بڑے جانور نہیں ہیں اور آج ہی نانگا پربت بیس کیمپ ٹریک سے واپس آئے ہیں۔ فی الحال مزید ٹریک کی ہمت نہیں ہے۔"

"آپ ٹریک کرتے ہو تو کشرونیرل (KASHRO NIRIL) سے سکردو جاؤ۔ یہ ٹریک سکردو جانے کا سب سے چھوٹا راستہ ہے۔ یہ بھی دیکھنے والا چیز ہے۔ اس راستے سے ہمارا لوگ پانچ یا چھ گھنٹے میں سکردو پہنچ جاتا ہے۔"

"صرف پانچ چھ گھنٹے میں سکردو؟" میں واقعی حیران ہوا۔

"اور کیا؟ فجر کے وقت نکلتا ہے اور عصر کی نماز سکردو کے علاقے میں پڑھتا ہے۔"

"کمال ہے۔ اس ٹریک کا ذکر میں نے کہیں بھی نہیں پڑھا۔"

"اُدھر سے دو راستے جاتے ہیں۔ ایک ہرپوئی سے اور دوسرا برنک کھنڈ سے۔"

"آپ شاید ہرپو۔لا (HARPO LA) اور بنگ۔ لا (BANAK LA) کہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دوست امجد تجوانہ نے پچھلے سال بنک۔لا کیا تھا۔ شاید تین یا چار دن کا ٹریک ہے۔"

"آپ کے لیے ہوگا۔ ہم لوگ ایک یا دو دن میں پہنچ جاتا ہے۔"

"کشرونیرل اس علاقے کے لیے کچھ عجیب سا نام نہیں ہے؟"

"اُس جگہ کا اصل نام کشیرے نیرل ہے۔ ہم لوگ کشمیریوں کو کشیرے اور چراگاہ کو نیرل بولتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس جگہ کشمیر سے آئے ہوئے لوگ آباد تھے۔ پھر وہ واپس چلے گئے اور ہمارے لوگوں نے اُن کی بستی اور چراگاہ کو کشرونیرل کہنا شروع کر دیا۔ آپ کشرونیرل کو عجیب سمجھتا ہے تو کینی چھلینی کیسا لگے گا؟"

"کینی چھلینی؟ یہ کہاں ہے؟"

"اُس چوٹی کے پاس سیدھے ہاتھ والی ڈھلوان کے درمیان میں جو بڑا بڑا دراڑ نظر آتا ہے ہم لوگ اُسے کینی چھلینی بولتے ہیں۔ کینی چھلینی کا مطلب کالی شلوار ہوتا ہے۔" اُس نے ایک پہاڑی کی ڈھلوان کے دوشاخہ کٹاؤ کی طرف اشارہ کیا۔

"کالی شلوار؟ منٹو کی کالی شلوار اس بستی میں کیسے پہنچ گئی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہماری اپنی شلوار ہے جی۔ کسی منٹو ونٹو کی نہیں ہے۔ آپ ذرا غور سے دیکھو، اُس دراڑ کا شکل کالی شلوار جیسا لگتا ہے کہ نہیں لگتا؟"

"میرے خیال میں بالکل نہیں لگتا۔" میں نے ڈھلوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لگتا ہوتا تب بھی اعتراف نہ کرتا۔

منٹو کا بدنام افسانہ اتنے پاکیزہ علاقے کا ہم نشیں کیسے ہوسکتا ہے؟

''کینی چھلینی میں کیا خاص بات ہے؟''

''بس جگہ کا نام ہے۔کوئی خاص بات نہیں۔ادھر جانا تھوڑا مشکل ہے۔بکر وال لوگ بھی بہت کم جاتا ہے۔آپ کشرونیرل کو عجیب سمجھ رہا تھا۔اس لیے یہ نام بتایا ہے۔''

''جس چوٹی پر کینی چھلینی ہے اُس کا نام کیا ہے۔''

''اُس کا نام تینگلی ہے۔کچھ لوگ موکھیلی بھی کہتے ہیں۔''

''ابھی آپ نے بتایا تھا کہ تینگلی اور موکھیلی کشرونیرل میں ہیں۔''

''ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی ہیں۔ہماری زبان میں موکھیلی ایسی چیز کو بولتے ہیں جو سب سے الگ نظر آتا ہو۔تینگلی کا مطلب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔اس لیے جو پہاڑ اکیلا نظر آئے اُسے موکھیلی یا تینگلی بول دیتے ہیں۔اس لیے یہ کئی جگہ پہ ہوسکتا ہے۔''

''ویسے تو آپ کے گاؤں کا نام بھی عجیب ہے۔اس کا کوئی مطلب بھی ہے؟''

''ہے ناں۔ہم لوگ اُس جگہ کو تھینگ بولتا ہے جو باقی علاقے سے نیچے ہو۔یہ گاؤں بہت نیچے والی جگہ پر ہے اس لیے تھینگ کہلاتا ہے۔''

''بہت شکریہ جناب۔آپ سے بات چیت کرنے میں بڑا مزہ آیا۔کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت چاہتے ہیں۔اب اجازت دیں۔''

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور گاڑی کے قریب آ گیا۔

قاسمی صاحب ایک پیاری سی گول مٹول ننھی پری کو ماڈل بنا کر چوبی پُل اور دریا کی تصویریں بنا رہے تھے۔انھیں بلانے کے لیے بار بار ہارن بجانا پڑا۔

تھینگ پائیں سے چند منٹ کے فاصلے پر واقع تھینگ بالا بھی فطرت کا ایک شاہکار ہے۔

اس جگہ اللہ والی جھیل سے آنے والی پری شنگ ندی چھوٹی سی جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

پس منظر میں تینگلی چوٹی اس جھیل کے منظر نامے کو بہت خوب صورت بنا دیتی ہے۔

یہ چوٹی رام کھہ سے اللہ والی جھیل تک ہم قدم رہتی ہے اور نئے نئے رنگ دکھاتی آتی ہے۔

اس کی برفانی چوٹی توتے کی چونچ کی طرح آگے کی طرف جھکی ہوئی ہے۔

اس مشابہت نے مجھے کنکارڈیا ٹریک کی ملکہ مشہ بروم یاد دلا دی۔

قدوقامت کے لحاظ سے یہ چوٹی اُس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی،مگر اس کا دیومالائی حسن جب تھینگ بالا کی دریائی جھیل میں اُترتا ہے تو دل موہ لیتا ہے۔

وادیِ پری شنگ میں اللہ والی جھیل نہ ہوتی تب بھی،تھینگ پائیں،تھینگ بالا،تینگلی اور موکھیلی کی دید کے لیے سفر کرنا گھاٹے کا سودا نہ ہوتا۔

وادیِ پری شنگ کا آخری قصبہ گوٹم سر تھینگ بالا کا جڑواں گاؤں ہے۔تھینگ بالا کی آبادی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی کہ گوٹم سر آ جاتا ہے۔یہ ایک عام سا پہاڑی قصبہ ہے لیکن تھینگ بالا سے یہاں تک پھیلا ہوا سبزہ زار اسے خاص منظر بنا دیتا ہے۔

اس سبزہ زار کے پھولوں اور پانیوں کو ننھے منّے دیوسائی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اس جگہ بھی چند منٹ رک کر فطرت کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنا ضروری ہے۔

گوٹم سر کی مرکزی آبادی ننھی منّی پہاڑی پر واقع ہے۔ہم نے مزید اونچا ہونے کے لیے ایک زیرِ تعمیر مکان کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کی۔

اردگرد سے آنے والی غضبناک آوازوں نے یہ کوشش ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

وہ سمجھے ہوں گے کہ ہم گھروں میں تاک جھانک کر کے خواتین کی تصویریں بنانا چاہتے ہیں۔

ہم نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کرنا نہیں چاہتے۔

اس جگہ سے گوٹم سر،تھینگ بالا،تھینگ پائیں،چک گاؤں اور''جھیل''ایک فریم میں عکس بند کیے جاسکتے ہیں،اس لیے ہم ذرا بلندی پر جا کر دور تک نظر آنے والی وادی کی تصویر بنانا چاہتے ہیں۔

اُنھوں نے ہماری وضاحت قبول نہیں کی اور فوری طور پر چھت سے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

اخلاقی طور پر اُنھیں یہ حکم دینے کا پورا حق حاصل تھا۔

ہم تھوڑی سی''بیستی''اور بہت سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر نیچے اتر آئے۔

بلندی پر جا کر تصویر بنانے کی تجویز قاسمی صاحب نے پیش کی تھی۔

میں نے اُنھیں چھیڑنے کے لیے انھی کے انداز میں گنگنانا شروع کیا:

''نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن...... بڑے بے آبرو ہو کر ترے گوٹم سے ہم نکلے''

قاسمی صاحب نے چھیڑنے کی بجائے شعر کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے فرمایا:

''مصرع درست کر لیں ڈاکٹر جی،غالب نے بڑے بے آبرو نہیں،بہت بے آبرو کہا تھا۔''

''نشے کی ترنگ میں کہہ دیا ہوگا۔شاعر اصل میں کہنا یہ چاہتا ہے کہ بڑے بے آبرو ہوکر نکلے، چھوٹے بے آبرو ہوئے بغیر نکل آئے۔کتنا عمدہ حسنِ خیال ہے، آپ الفاظ تول رہے ہیں۔''

غالب شناسی کا اصل مقصد بے آبرو ہونے کی جھینپ مٹانا تھا۔ ہم سڑک پر پہنچے اور ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر تھینگ بالا کی سمت دیکھا۔ دریائی جھیل کی تھوڑی سی جھلک نظر آ گئی۔

یہ جھلک گویا تریاق بن گئی۔ بے آبروئی کا احساس گوٹم سر کی طرف سے آنے والے پانیوں میں بہہ گیا۔ ہم نے تصویر بنائی اور اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

گوٹم سر سے نکلتے ہی جیپ ٹریک ختم ہوجاتا ہے اور جھیل تک جانے والی پانچ منٹ کی ایک پتھریلی چڑھائی پیدل طے کرنا پڑتی ہے۔ چڑھائی کے اختتام پر پی ڈبلیوڈی کا ریسٹ ہاؤس ہے۔

ریسٹ ہاؤس بظاہر ویران نظر آرہا تھا۔نصرت دین نے بتایا کہ استور میں ایکسین (XEN) کے دفتر سے ریسٹ ہاؤس کی بکنگ کروائی جاسکتی ہے۔

ریسٹ ہاؤس سے آگے وہ پانی جھلک دکھاتے ہیں جنھیں اللہ والی جھیل کا نام دیا گیا ہے۔

قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دراصل سبزہ زار ہے۔

سکردو اور استور کی سرحد بنانے والی برف پوش چوٹیوں کے اردونگ گلیشیر سے آنے والا پہاڑی نالا، سرسبز وشاداب میدان میں بہت سے لوپ (U) بناتا ہوا گزرتا ہے۔

اس نالے کا مقامی نام اردونگ گاہ ہے۔میدان ''اردونگ جل'' کہلاتا ہے۔

جل مقامی زبان میں ہموار میدان کو کہتے ہیں۔اس میدان کو اردونگ میڈوز کہنا چاہیے۔

اردونگ میڈوز میں سے گزرتی ہوئی اردونگ گاہ کے لوپ ''اللہ'' کی مانند نظر آتے ہیں۔

اس لیے اردونگ جل کے رومانی نام کو اللہ والی جھیل کا پرتقدس نام دے دیا گیا ہے۔

اردونگ گاہ کے اللہ والے پانی سبزہ زار سے گزرنے کے بعد ایک اصلی جھیل بھی بناتے ہیں جس کا مقامی نام اردونگ سر اور صفاتی نام گوٹم سر ہے۔

گوٹم کے معنی گہرا......اور سر کے معنی جھیل ہیں......عرف عام میں یہ گوٹم جھیل کہلاتی ہے۔

اللہ والی جھیل اور گوٹم جھیل دو الگ الگ جھیلیں ہیں، یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

اردونگ جل کے سبزہ زار میں کھڑے ہوکر دیکھا جائے تو پوری کوشش کے باوجود ناگن کی طرح بل کھاتے پانی لفظ ''اللہ'' سے نہیں ملتے، ڈبلیو (W) جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

انھیں اللہ سے ملانے کے لیے ایک ویو پوائنٹ پر چڑھ کر آسمان کے قریب جانا پڑتا ہے۔

قاسمی صاحب ویو پوائنٹ پر جا کر اللہ والی کی تصویریں بنانا چاہتے تھے۔

میں نے میدان میں بہتے ہوئی ڈبلیو کی تصویر بنائی اور کیمرا قاسمی صاحب کے حوالے کر دیا کہ اوپر جا کر اگر اللہ والی کی پوری شکل نظر آ جائے تو میرے لیے بھی تصویر بنالائیں۔

سبزہ زار میں سے گزرتے پہاڑی نالے کو جھیل کہنا سیّاحتی جھوٹ کے مترادف ہے۔

مگر اردونگ میڈوز بہت بڑا سیّاحتی سچ ہے، لاجواب بھی اور بے مثال بھی۔

اس کی سرسبز شادابی میں حسنِ فطرت کی نہریں لہراتی ہیں......اور کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہیں۔

اردونگ گاہ کے شیشہ فام پانی عرف اللہ والی جھیل
اردونگ جل کی سرسبزی، شادابی اور گل زاری
گوٹم سر کے ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت گنگناتے ہیں
اور آئینہ گری میں برف پوش چوٹیوں کے عکس جھلملاتے ہیں

استور انتظامیہ کی خدمت میں گزارش ہے کہ وادی کے سیّاحتی مقامات کی فہرست کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے۔ اللہ والی جھیل کے کا نام اب رائج ہو چکا ہے، اسے ''اردونگ میڈوز'' رہنے دیا جاتا تو شاید زیادہ پُرکشش ہوتا۔

وادیِ پری شنگ یا پری شنگ ویلی کی پبلسٹی علاقائی سیّاحت میں فروغ کا باعث بن سکتی ہے۔

اس وادی کے بہت سے مقامات سیّاحوں کے لیے مرکز نگاہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لوس گاؤں سے گوٹم سر تک پری شنگ ندی کے رنگ بدلتے روپ
تھینگ پائیں کا دل والا جزیرہ
تھینگ بالا کا چھوٹا دیوسائی اور منّی گوٹم جھیل

ہمیں وادی استور کی مُنّی سے پیار ہوگیا ہے، اس لیے تھینگ بالا کی جھیل کو بھی منّی کہیں گے۔

اور سب سے اہم یہ کہ وادیِ پری شنگ کی ہر بستی نانگا پربت کا ایک منفرد ویو پوائنٹ ہے۔

وادیِ استور کا سیّاحتی اثاثہ اللہ والی جھیل کا نام نہیں،

وادیِ پری شنگ میں لوس داس سے اردونگ میڈوز تک پھیلا ہوا طلسم جاں فزا ہے۔

ہماری خوش گمانی پر اللہ والی جھیل کے پرستار بصد شوق اختلاف کر سکتے ہیں۔

ہم بہرحال اللہ والی سے زیادہ پری شنگ کے پرستار بن گئے ہیں۔

اس پری شنگ سے ہوا ایسا تعلق جانم
جیسے اصنام کا رشتہ ہو پرستار کے ساتھ

اللہ والے سبزہ زار یا اردونگ جل کی جنوب مشرقی سمت سٹیڈیم نما سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔
میں ایک سیڑھی پر بیٹھ کر کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والے بچوں کے کھیل سے لطف اندوز ہونے لگا۔
اس دوران ایک وی لاگر چند مقامی لوگوں کے ساتھ آیا اور میرے قریب بیٹھ کر اللہ والی جھیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ اُن کی باتوں سے پتا چلا کہ اردونگ جل عرف اللہ والی جھیل سے سکردو کے لیے متعدد ٹریک نکلتے ہیں، یعنی اِن سب کا بیس کیمپ اردونگ جل ہے۔
ٹریک اور بیس کیمپ میرے لیے بہت پرکشش موضوع تھا۔
میں نے ان کی تفصیلات ذہن نشین کر لیں۔
یہ تفصیلات معمولی سی درستی، ترمیم اور اضافے کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔
سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پی ڈبلیو ڈی ریسٹ ہاؤس کی طرف دیکھیں تو عمارت کے اوپر چٹیل اور بے آب و گیاہ چٹانی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے کی انتہائی بلندی تقریباً ۵۱۰۰ میٹر ہے اور اسے پونیاں ٹیس کین کہتے ہیں۔ مقامی زبان میں پونیا ٹیس کا مطلب راستے میں پڑا ہوا؛ اور کین کے معنی دیوقامت پتھر ہیں۔ نام سے ظاہر ہے کہ اس راستے میں بڑے بڑے چٹانی پتھر آتے ہوں گے۔ سنگلاخ سے گزرنے والا یہ انتہائی دشوار گزار راستہ سکردو کے علاقے کچورا تک پہنچتا ہے اور عام آمدورفت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔
سبزہ زار کے اُس پار ہرپو (HARPO) نامی علاقہ ہے۔
ہرپو۔لا (HARPO LA) سکردہ جانے کے لیے مختصر ترین راستہ اور ایک تاریخی درّہ ہے۔
ڈوگرہ دور میں لکھپت سنگھ کشتواریہ نے اسی درّے سے گزر کر استور پر قبضہ کیا تھا اور راجہ جبار خان مقپون نے خراج دینے کا وعدہ کر کے اپنا راج پاٹ بچایا تھا۔
ہرپو لا ٹریک کی انتہائی بلندی ۴۵۰۰ میٹر اور دورانیہ تین دن ہے۔ اس کے بعض مراحل تکنیکی مہارت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ ٹریک وادیِ روندو کے صدر مقام دمبوداس تک جاتا ہے۔ وہاں سے سکردو جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ مل جاتی ہے اور ڈیڑھ گھنٹے میں سکردہ پہنچا دیتی ہے۔

اللہ والے میدان کے شمال مشرقی سمت نظر آنے والی بنک چوٹی پر سے گزرنے والا راستہ بنک لا (BANAK LA) کہلاتا ہے۔ اس کی بلندی لگ بھگ ۵۰۰۰ میٹر ہے۔
بنک لا عبور کر کے سکردو جانے کے لیے دو راستے اختیار کیے جاتے ہیں۔
ایک ٹریک وادی بشو (BASHO) اور دوسرا اپر کچورا جھیل کی طرف جاتا ہے۔
دونوں ٹریک دشواری کے لحاظ سے درمیانے درجے کے ہیں۔ ان کا دورانیہ پانچ دن ہے۔
بنک لا ٹریک کی چڑھائی بہت زیادہ عمودی نہیں ہے اور تکنیکی مراحل پیش نہیں آتے۔
بنک لا سے کے مخالف سمت، دائیں ہاتھ کا راستہ اختیار کر کے وادیِ استور کے علاقے بوبن (BUBIND) اور گدائی اور وہاں سے بذریعہ جیپ چلم چوکی، منی مرگ اور دیوسائی پہنچا جا سکتا ہے۔
قاسمی صاحب ویو پوائنٹ سے اللہ والی جھیل کی تصاویر بنا کر واپس آئے تو ہم نے چائے پینے کے لیے خیمہ ٹک شاپ کا رُخ کیا۔ وہاں چند نوجوان عصر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے صفیں باندھ رہے تھے۔ ہم بھی شامل ہو گئے۔ نماز کے بعد رسمی تعارف ہوا۔
سرگودھا بائیکرز کا یہ گروپ دیوسائی کے راستے سکردو جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
گپ شپ کے دوران انکشاف ہوا کہ اس کے اراکین فیس بک پر فاروق عمر سیرو کی پوسٹ اور تصاویر سے متاثر ہو کر سفر کے لیے نکلے ہیں۔
میں نے یہ بتانے کی ''غلطی'' کر دی کہ مجاہد قاسمی صاحب فوٹو گرافی کے علاوہ شجرہ نسب میں بھی فاروق عمر سیرو کے سگے باپ ہوتے ہیں۔
یہ انکشاف ہوتے ہی قاسمی صاحب وی وی آئی پی شخصیت بن گئے۔
اُن کے ساتھ سیلفی لینے اور گروپ فوٹو بنانے کا سلسلہ چل نکلا۔ قاسمی صاحب نے میرا تعارف سفرنامہ نگار کی حیثیت سے کروایا، مگر ''وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''۔
سوشل میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو چاروں شانے چت کر دیا ہے اور کتاب ہار مان چکی ہے۔
چائے کے بعد نصرت دین نے واپسی کے لیے شور مچانا شروع کر دیا۔
ہم گوٹم سر جھیل کے پانیوں میں غروبِ آفتاب کا منظر عکس بند کرنا چاہتے تھے مگر نصرت دین کا کہنا تھا کہ ہیڈ لائٹس ٹھیک نہیں ہیں، اندھیرا چھا گیا تو واپسی کا سفر خطرناک ہو جائے گا۔
وادیِ پری شنگ کے اردونگ جل میں استور کے سفر کا بہترین دن گزار کر ہم نے واپسی کا

سفر شروع کر دیا۔ اردونگ میڈوز اور اردونگ گاہ کا اجمالی منظر نامہ ملاحظہ فرمائیے:

فطرت عیاں ہے چار سو اور آب ہے رواں
یہ حسن دل رُبا ہے ذرا آ کے دیکھیے

اللہ والے میدان سے واپسی کا سفر مغرب سے پہلے شروع ہوا۔ سورج بلند و بالا چوٹیوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا اور سنہری شام پر رات کی سیاہی غالب آتی جا رہی تھی۔ برف پوش چوٹیاں البتہ نارنجی رنگ میں رنگی جانے لگی تھیں۔ ہم تھینگ پائیں کے قریب بننے والی دریائی جھیل کی لہروں پر کرنوں کا رقص اور پانی میں ہلکورے لینے والی برف پوش چوٹیاں عکس بند کرنا چاہتے تھے۔

سورج ہماری خواہش پر توجہ دیے بغیر اپنی کرنیں سمیٹ کر کسی چوٹی کے پیچھے چھپ گیا۔

منظر کشی کا وقت ختم نہیں ہوا تھا۔ بلیو آور کے ڈرامائی رنگ عکس بند کیے جا سکتے تھے۔

مگر نصرت دین کی نیت بدل چکی تھی۔

ہم اسے گاڑی روکنے کے لیے کہتے، وہ بریک لگانے میں اتنی دیر کرتا کہ منظر گزر جاتا۔

ہم شکوہ کرتے تو وہ جواب دیتا کہ اس جگہ کی تصویر آپ آتے وقت بنا چکے ہیں۔

قاسمی صاحب نے اُسے روشنی کے زاویے کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی،

مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا، عشاء کے وقت مدینہ گرین ہوٹل پہنچ کر بریک لگائی۔

استور پہنچتے ہی اگلے پروگرام کی فکر ہوئی۔ نصرت دین نے بتایا تھا کہ منی مرگ کے لیے گاڑیاں مدینہ گرین ہوٹل ہی سے جاتی ہیں۔ ہم نے مدینہ گرین ہوٹل کے منیجر سے رابطہ کیا۔

مگر...... تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ......(بندہ تدبیر لڑاتا ہے، قسمت قہقہہ لگاتی ہے)

اس ضرب المثل کے اصل معنی اُس وقت سمجھ آئے جب ہم دومیل کی خیمہ بستی میں ایک رات قیام کی منصوبہ بندی کر چکے تھے اور مدینہ گرین ہوٹل کے لان میں کھڑی ہوئی جیپ کے ڈرائیور کے ساتھ منی مرگ ٹور کے معاملات طے کرنے میں مصروف تھے۔ اِدھر معاملات طے ہوئے......

اُدھر مجاہد قاسمی صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی اور منی مرگ کے سفر پر سوگِ مرگ طاری کر دیا۔

اُن کی بیگم کے چچا وفات پا گئے تھے۔

اور اُنھیں فوری طور پر مانسہرہ پہنچنے کے بیگم شاہی احکامات سنائے جا رہے تھے۔

اُنھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ پوری کوشش کے باوجود شاید نماز میں شرکت نہ کر سکیں۔

بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ وہ آئیں گے تو نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی، چاہے کتنی ہی دیر ہو جائے۔

اس دھمکی کے بعد کسی بہانے کی گنجائش نہ رہی۔ منی مرگ کی بجائے راولپنڈی کے لیے گاڑی تلاش کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔ استور سے مانسہرہ کے لیے تیز رفتار ذریعہ ٹیکسی ہے۔

قاسمی صاحب سسرالی عزیز کے لیے اتنی مہنگی ''فضول خرچی'' پر آمادہ نہیں تھے۔

ناٹکو بس سروس میں اگلے چار دن تک نشست دستیاب نہیں تھی۔

محفوظ ٹریولز اکلوتا انتخاب رہ گئی۔ بس سٹاپ پر پہنچے تو ایئر کنڈیشنڈ بس کی زبوں حالی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ محفوظ ٹریولز محفوظ ہو گی، طویل سفر کے لیے مناسب نہیں ہے۔ دس بجے سٹارٹ ہونے والے ٹائم نے بس سٹاپ سے نکلتے نکلتے ساڑھے بارہ بجا دیے تو اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

استور کا موسم معتدل تھا۔ جوں جوں جگلوٹ قریب آتا گیا گرمی کی شدّت میں اضافہ ہوتا گیا۔

کھڑ کیدہ کھڑ کیدہ بس کا خستہ حال ایئر کنڈیشنڈ چند منٹ چلنے کے بعد جواب دے گیا۔

بس کے شیشے کھلنے والے نہیں تھے، اس لیے تھوڑی ہی دیر میں تپش اور حبس ناقابلِ برداشت ہو گیا اور پسینے چھوٹنے لگے۔ برقع پوش خواتین کی حالت خاصی خراب تھی۔

بس ڈرائیور کے ساتھ اُن کی گرما گرمی نے اندرونی ماحول مزید بھڑکا دیا۔

محفوظ ٹریولز استور کی مصروف ترین ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ سنا ہے کہ اس کے مالک رفاہِ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اُن سے گزارش ہے کہ وادیِ استور میں سیّاحوں کی فلاح پر خصوصی توجہ دیں اور روزانہ کی بنیاد پر ایک ''ٹورسٹ ٹائم'' چلا دیں۔

کرایہ بے شک زیادہ رکھیں مگر سفر کے لیے آرام دہ نشستیں اور سہولیات فراہم کی جائیں۔

خبر گرم ہے کہ سی پیک منصوبے کے تحت شونٹھر ٹنل پر کام شروع ہو چکا ہے۔

وادیِ نیلم کو استور سے ملانے والی یہ شاہراہ مکمل ہوتے ہی چین سے اسلام آباد جانے والا راستہ استور سے گزرے گا اور اس شہر کی عظمت رفتہ واپس آ جائے گی۔

عظمت رفتہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے۔ استور کبھی ریاستِ دردستان کا دارالحکومت رہا ہے۔

اس تابناک تجارتی اور سیّاحتی مستقبل کے پیشِ نظر استور اور اسلام آباد کے درمیان معیاری ٹرانسپورٹ سے بہتر رفاہی کام اور کیا ہو سکتا ہے؟

داسو سے آگے سورج ڈھلنے کی وجہ سے بیرونی تپش کم ہوئی تو اندرونی گرمی بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

بشام میں کھانے کے بہانے طویل وقفہ کیا گیا جس کی وجہ سے ماحول مزید بہتر ہو گیا۔

مجاہد قاسمی صاحب مانسہرہ انٹرچینج پر اتر گئے تو احساس ہوا کہ واپسی کا پروگرام بدلنا پڑے گا۔

ہنگامی واپسی سے پہلے ہمارا ارادہ تھا کہ راولپنڈی پہنچ کر قاسمی صاحب کے گھر آرام کریں گے اور میاں صابر حسین اسلام آبادی کو اپنی آمد کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔

میاں صاحب ہمارے پیارے دوست، سخت جان ٹریکر اور اَن تھک بائیکر ہیں۔ اُن کا آبائی شہر بورے والا ہے۔ فیملی وہیں رہتی ہے۔ وہ خود اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں اور اپنے بھائی کی کمپنی ''ایکسپرٹ لاجسٹک اسلام آباد'' میں منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ دوست احباب ان سے ملے بغیر اسلام آباد سے گزر جائیں تو خفا ہو جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے منائے جاتے ہیں۔

انھیں منانا ضروری ہے جی۔ پنڈی اسلام آباد کے ہوٹلوں میں قیام وطعام بہت مہنگا پڑتا ہے۔

اس مرتبہ ہم اُنھیں ''منانے'' کا موقع حاصل کرنے کے لیے اُسی طرح نظریں چرا کر گزرنا چاہتے تھے جس طرح وہ ہمارے غریب خانے کے قریب سے گزرنے کے بعد فون کرتے ہیں:

''ہم ڈیفنس ویو میں سے گزر رہے تھے، وقت کی کمی کے باعث ملاقات نہ کر سکے۔''

قاسمی صاحب مانسہرہ میں اتر گئے تو اُن کے گھر آرام کرنے کا انتخاب باقی نہ رہا۔

اب دو راستے تھے۔ براہِ راست وہاڑی چلے جائیں یا میاں صاحب کو روٹھا کر منانے کا ارادہ اگلے سفر تک ملتوی کر دیں۔

اٹھارہ گھنٹے ''تندوری'' سفر کے بعد آٹھ گھنٹے اور سفر کی ہمت نہیں تھی۔

میاں صابر حسین اسلام آبادی سے ملے بغیر اسلام آباد سے گزر جانا ممکن ہے۔

ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

میاں صاحب...... ننھی سی جان...... چاہیں تو آفس کے ریٹائرنگ روم سے کام چلا سکتے ہیں یا اپنے بھائی کے بنگلا نما گھر میں رہ سکتے ہیں۔ انھوں نے آئی ٹین فور میں پانچ مرلے کا گھر صرف اس لیے کرائے پر لے رکھا ہے کہ اسلام آباد سے گزرنے والے دوست احباب کی مہمان نوازی کے تقاضے احسن طریقے سے نبھائے جا سکیں...... اتنے پرخلوص جذبے کی توہین کون کر سکتا ہے؟

لہٰذا صبح چار بجے کال کر کے اُنھیں جگایا اور سلام دعا کرتے ہی لمبی تان کر سو گئے۔

میاں صاحب نے زیادہ لمبی تان کا موقع نہیں دیا۔ نو بجے ناشتے کے لیے جگا دیا۔

محمدی نہاری ہاؤس میں پُرتکلف ناشتا اور اُن کی دفتری چائے، جو اتنی خوش ذائقہ اور نشہ آور ہوتی ہے کہ ایک پیگ سے کام نہیں چلتا، دوسرے کی فرمائش ''بدوبدی'' کرنا پڑتی ہے۔

اسلام آباد سے وہاڑی کے لیے مناسب ٹرانسپورٹ رات کے وقت ملتی ہے۔

ہم نے دوبارہ بستر پر لیٹنے کی بجائے پاکستان مونومنٹ، شکر پڑیاں اور راول ڈیم کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میاں صاحب اپنی دفتری مصروفیات چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو لیے۔

اُن کی ''قربانی'' کا درست اندازہ اُس وقت ہوا جب راول ڈیم سے واپسی پر انھوں نے ایک ہسپتال کا رُخ کیا اور کمر درد سے چھٹکارا پانے کے لیے درد کش انجکشن لگوائے۔

ہمیں بہت سا پچھتاوا اور تھوڑا سا شکوہ ہوا۔ وہ اگر کمر درد کے بارے میں پہلے بتا دیتے تو ہم انھیں زحمت دینا ہرگز گوارا نہ کرتے اور خود بھی لمبے لیٹ ہو کر تھکن اتارنا پسند کرتے۔

اب کیا کہیں...... نوازش...... کرم...... شکریہ...... مہربانی...... مناسب الفاظ کہاں سے لائیں؟

ڈنر کے لیے میاں صاحب نے حسبِ معمول آئی ایٹ مرکز کے حبیبی ریستوران کا انتخاب کیا۔

کھانے کا انتظار کرتے ہوئے ہم نے...... 'تقدیر زندخندہ''...... اور انھیں خفا کرنے کے منصوبے کی تفصیل سنائی۔ انھوں نے خفا ہونے کی بجائے طنزیہ قہقہہ لگایا اور یوں گویا ہوئے:

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر چرا سکو گے
ہمیں چھوڑ کر حبیبی کہیں تم نہ جا سکو گے

نانگا پربت روپل فیس بیس کیمپ ٹریک کے لیے شروع کیا جانے والا سفر بخوبی اختتام کو پہنچا۔

مگر وادیِ استور کی رعنائیوں سے دل ابھی بھرا نہیں۔

خاص طور پر برزل پاس اور منی مرگ کی کسک کانٹا بن کر چبھتی ہے۔

ان دونوں کے ساتھ چلم چوکی، دومیل اور رینبو جھیل

دعوتِ نظارہ دینے کے ساتھ ساتھ دہائی بھی دیتے ہیں:

چھوڑ گئے ظالم ہمیں ہائے تڑپتا چھوڑ گئے

یہ سب فطرت کدے ایک راستے پر ہیں، مگر الگ الگ، مزاج، مستی اور مدہوشی رکھتے ہیں۔

منی مرگ زندہ، صحبت باقی۔ بشرطِ صحت اور زندگی

❀❀❀❀❀